آئینہ گر
(افسانے)
منزہ احتشام گوندل

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

Ayna Gar
By: Munazza Ehtasham Gondal
Jhelum: Book Corner.
144p.
1. Urdu Literature - Short Stories
ISBN: 978-969-662-069-3

اشاعت: جنوری 2017ء

آئینہ گر

منزہ احتشام گوندل

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ناشر:
گگن شاہد، امر شاہد
بک کارنر
پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز، جہلم، پاکستان

Publisher:
Gagan Shahid & Amar Shahid
Book Corner
Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum. Pakistan.

CALL NOW 0544-614977, 0544-621953 info@bookcorner.com.pk
Find us on: facebook. book corner showroom 0321-5440882
WWW.BOOKCORNER.COM.PK

امی کے نام

وہ "سرسوتی" جو دھرتی سے پھوٹتے سات ساگروں کی ماں ہے

فہرست

اعتراف

میرے مخاطب!

میرے قاری!

میرے ناظر!

میرے پاس چند گناہ ہیں۔ میں جن کا اعتراف کرنے آئی ہوں۔

مجھے یقین ہے تم مجھے ان گناہوں پر معافی نامہ دے دو گے۔

میرے یہ چند گناہ بھی میرے گرد بستے ہزاروں انسانوں کی عطا ہیں۔ اگر میں تن تنہا اس دنیا میں ہوتی تو کیا میری ذات سے کوئی گناہ سرزد ہوتا؟ میں کس کا دل دکھاتی، کس کا گِلہ کرتی، کس سے جھوٹ بولتی، کس کی چوری کرتی؟

انسان معاشرتی طفیلیہ ہے۔ وہ کیا کرے۔ وہ تو صاف ستھرا معصوم پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ معاشرہ اسے مجرم بنانے کے لیے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر یہ اس معصوم زندگی پر جھپٹتا ہے اور اس کو گناہ گار بنا کر دم لیتا ہے۔ اور پھر اس کے گناہ اور ثواب کے فلسفے بھی عجیب ہیں۔ یہ کیسا معاشرہ ہے اور یہ کس قسم کے لوگ ہیں جو ثواب کے زمرے میں نمازوں، روزوں کو ڈال کر جنت اپنے نام کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور باقی ساری عمر اطمینان کے ساتھ گناہ کرتے ہیں۔

میرے قاری!

مجھے اختلافات سے محبت ہے۔ کیونکہ اختلاف کے اندر زندگی ہوتی ہے۔ روانی ہوتی ہے۔ اختلاف نہ ہوتو چیزیں جامد ہو جاتی ہیں۔ بے حس اور بے حرکت ہو جاتی ہیں۔ اختلاف ہوتو گفتگو کے اندر روانی رہتی ہے۔ زندگی کا حسن بڑھتا ہے۔ کائنات کا توازن قائم رہتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں رشتوں میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں۔ دوستی میں اختلاف آجائے تو دوستی ختم ہوجاتی ہے۔ رشتے میں اختلاف آجائے تو رشتہ ختم ہوجاتا ہے۔

ویسے تو ''جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے'' اس فارمولے پر ساری قوم عمل کرتی ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا سچ بھی نہیں۔ مگر محبت میں اختلاف کی گنجائش کسی نے بھی نہیں رکھی۔ آپ کو کسی کے ساتھ محبت ہے تو آپ اس کے ساتھ اختلاف نہیں کر سکتے۔ چاہے وہ جنسی اختلاط کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ اختلاف کریں گے تو محبت ختم ہوجائے گی۔

میرے ناظر!

یہ کیسی محبت ہے جو اختلاف کرنے پر ختم ہوجاتی ہے؟

یہ کیسے رشتے ہیں جو خوشامد کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں؟

یہ کیسی دوستیاں ہیں جن کی بنیاد تائید پر ہے۔ تردید کریں گے تو دوستی ختم ہوجائے گی۔

کیا یہ پابندی نہیں؟

کیا یہ جکڑن نہیں؟

اور پھر وہ لفظ جس کو ظرف کہتے ہیں اس کا استعمال کہاں پر ہوگا؟ اگر انسانی رشتوں کی خوبصورتی اور یکجائی خوشامد، تائید، عدم اختلاف اور بے جا اعتراف پر قائم ہے تو اعلیٰ ظرفی کہاں گئی۔ پھر تو اس لفظ کو لُغت سے نکال دینا چاہیے۔

میرے مخاطب!

خدا کیا ہے؟

خدا کس احساس کا نام ہے؟ ہر قوم اور ہر امت کے لیے خدا الگ الگ ہے۔ خدا اسی ظرف کا نام تو ہے جو اپنے بندوں کی ہر طرح کی خطا سے درگذر کرتا ہے۔ جو برداشت کرتا ہے۔ جو پی جاتا ہے، جو سہتا ہے، جس کا رشتہ خوشامد کے ساتھ نہیں جُڑا ہوا۔ جس کا رشتہ جھوٹی نفرتوں اور صلہ مانگتی محبتوں کے ساتھ نہیں جُڑا ہوا۔ جو بے حساب، بے لوث اور بے پناہ ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر یہ

سارے اوصاف ہوں تو کیا وہ خدا کا نائب نہیں؟

ایسے ہی کتنے گناہ ہیں جن میں، میں نے خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے اپنی ذاتی آزادی اور خوشی کے چھوٹے چھوٹے لمحات چھینے، چُرائے حالانکہ وقت پر میرا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کہ دوسروں کا۔ مگر دوسرے لوگ میرا وقت برباد کرتے رہے اور اپنا وقت رائیگاں۔ اُن کا وقت خالی گیا اور میرا وقت انہوں نے تباہ کر دیا۔ میں نے خدا کے دیئے ہوئے تخیل اور تصور سے بے تحاشہ کام لیا۔ زندگی نے مجھ پر اوقات کو سخت تنگ کر دیا تھا، کہ اگر تصور لمحہ بہ لمحہ میرے کام نہ آتا تو میں کب کی مرگئی ہوتی۔ میں نے کتنی ہی چیزوں کا تدارک کتنی ہی دوسری چیزوں کے ساتھ کیا۔ میری ساری اب تک کی زندگی اسی طرح کے پیوند لگاتے گذری ہے۔ میں نے جینے کے لیے چھوٹے چھوٹے سہارے لیے ہیں۔ آوازوں کے سہارے، لفظوں کے سہارے، نگاہ کے سہارے، احساس کے سہارے۔ بری آواز کا مداوا اچھی آواز کے ساتھ، برے لفظوں کا مداوا اچھے لفظوں کے ساتھ، اور بری سوچ کا مداوا میں نے اچھی سوچ کے ساتھ کیا۔

میں آزادی کی جنگجو ہوں۔ آزادی جو میرے تخیل کے اندر ہے مگر باہر کہیں نہیں۔ میرے باہر سمجھوتے ہی سمجھوتے ہیں۔ دیواریں ہی دیواریں، رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں۔ مگر ان رکاوٹوں کو عبور کرنا بعض اوقات اس لیے بھی مشکل ہوجاتا ہے کہ اس عبوری دور کے بعد جسم کی دیوار پہ بہت سے برے الفاظ چسپاں ہوجاتے ہیں۔ ہم لفظوں سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔ ہم لفظوں کے بہکاوے میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم لفظوں کے ستم گذیدہ ہیں۔

لفظ جو ثقافت کی اولاد ہیں۔ لفظ جو بازی گروں کی بازی گری ہیں۔ لفظ جو ''ویشیا'' کی طرح مفاد کے پیچھے معانی بدلتے ہیں۔ یہ لفظ ہی ہیں کہ پورا معاشرہ جن کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے بے لفظ رشتے، خاموش خواہشات، کی وقعت اس طرح کے معاشروں میں کہاں ہوسکتی ہے جہاں ایک بہت بڑا جسمانی سطح کا رشتہ تین لفظوں کے کمزور ستونوں پر استوار ہے اور تین ہی لفظ اس کو دھڑام سے نیچے لے آتے ہیں ان تین لفظی رشتوں کے درمیان زندگیاں گذر جاتی ہیں۔ زندگیاں بن جاتی ہیں۔ زندگیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ تو ایک جکڑن ہے کہ جب جکڑے تو پھر اس سے چھٹکارے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ملتا۔

گناہ کے لیے دو طرح کے حوصلے چاہیں۔ ایک عمومیت اور دوسرا بے ضمیری۔ میرے اندر دونوں طاقتیں نہیں ہیں۔ میں اس گناہوں بھری دنیا میں رہ کر بھی ناطاقتی کی شکار رہی۔ ایک عام

انسان گناہ کی اصل لذت کے بہت قریب ہوتا ہے کیونکہ اس کا گناہ بھی اس کی طرح عام اور غیر معروف ہوتا ہے۔ اس کو گناہ کی نفسیاتی توجیہات کا نہیں پتا ہوتا۔ وہ طرح طرح کے وسوسوں اور خوفوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ گناہ کرتا ہے اور کر گذرتا ہے۔ جیسے وہ اپنی زندگی کے دوسرے روزمرہ کے کام کرتا ہے۔ انہیں کاموں کے درمیان وہ گناہوں کی لذتوں سے بھی لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں جو گناہ اور ثواب کی چھانٹی میں پڑی رہی اور جب چھانٹی ہو گئی تو احساس ہوا کہ اس دھندے نے مجھے اور زیادہ گناہ گار کر دیا۔ میں نے اپنے اندر کی عورت کو مارا ہے۔ میں ایک قاتل ہوں۔

شیطان اولادِ آدم کا دشمن ہے۔ اور اس دشمنی کی وجہ خداعزوجل کی خالص محبت اور عبودیت جو کہ محض شیطان کے حصے میں آتی ہے۔ میں سوچتی ہوں شیطان پر خالقِ دوجہاں کے احسانات اتنے ہیں کہ جو دوسرے انسانوں پر نہیں۔ اس کو رب نے راندۂ درگاہ کر کے جو آزادی فراہم کی وہ آدم کو کہاں میسر ہے۔ آدم تو طرح طرح کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مخلوق ہے، اور آدم کے ساتھ پوری آزادی اور حوصلے کے ساتھ چومکھی لڑائی لڑنے والا ایک اکیلا شیطان ہے۔ جس کو رب نے اپنی بارگاہ سے دھتکار کر سارے جہاں کا کینوس فراہم کر دیا ہے۔ اس کو سارے اختیارات دے دیئے ہیں۔ اُس کو تمام رنگینیاں فراہم کر دی ہیں۔

کیا یہ سارے اختیارات آدم کو بھی میسر ہیں؟

شیطان کو اس نے اس کی نافرمانی پر کھلا چھوڑ دیا۔ یہ آزادی سزا ہے یا جزا؟

مسجودِ ملائک پر اتنے کڑے پہرے اور اختیارات لگا دیئے۔ یہ اس پروٹوکول کے بعد آدم کا منصب ٹھہرا کہ اس پابندی کو نبھائے۔ ورنہ وہ اس قابل نہیں کہ ملائک کا مسجود کہلائے۔ ملائک کے پاس تو نفس نہیں صرف قلب ہی قلب ہے۔ اور جس کے پاس نفس نہیں اس کی پرہیزگاری اس کا کمال نہیں۔

کمال تو تب ہے جب صاحبِ نفس۔ نفس کی باگیں کسے۔

آدم اشرف المخلوق کیوں ہے؟

شیطان کے پاس:۔ نفس، روح، قلب ہے جسم نہیں۔

ملائک کے پاس:۔ روح، قلب ہے۔ نفس اور جسم نہیں۔

حیوان کے پاس:۔ روح، نفس، جسم ہے قلب نہیں۔

یہ محض انسان ہے جس کے اندر چاروں اجزاء بیک وقت موجود ہیں۔

اس کے اندر شیطان بھی ہے یعنی نفس۔

اس کے اندر روح بھی ہے۔ یعنی فرشتہ

اس کے اندر حیوان بھی ہے یعنی جسم۔

اور بذاتِ خود انسان بھی ہے یعنی قلب۔

آدم کا اوجِ کمال چاروں عناصر کے ظہورِ ترتیب میں ہے۔

آدم کی منتہا چاروں عناصر کی Complete Chemistrty میں ہے۔

ایک عنصر کم یا بیش ہوا سارا Compound تباہ و برباد۔ ایک جزو کی زیادتی یا کمی سے سارا Formula نا قابلِ استعمال۔

ہاں تو میں ضمیر کی پکڑ میں ہوں۔ وہ جو کوئی بھی میرے اندر ہے وہ میرا رہنما اور ہادی ہے۔ میرے قدم گناہ کی طرف اٹھنے کی کبھی ہمت ہی نہ کر سکے۔ نفس نے میری خوب کھنچائی کی۔ گمراہ کرنے والے دوست نے بڑے بڑے ترغیبات کے جال پھیلائے، خوب صورت سنہرے جال۔ مگر ہر دفعہ میری ناطاقتی آڑے آتی رہی۔ میں نے نفس کو کوڑے نہیں مارے۔ میں نے کبھی اس سے نفرت نہیں کی۔ نہ ہی اس کو بُرا سمجھا، اور نہ اس کو سزائیں دیں۔ مگر میں کبھی اس کی حاجت روائی بھی نہ کر سکی۔ مجھ پر پتھر پڑتے رہے۔ میں نے اس کی سزا بھگتی، جو میں نے کبھی کیا ہی نہ تھا۔ میں برداشت کرتی رہی۔ پورے حواس کے ساتھ، پوری چوکسی کے ساتھ، کامل سلامتی کے ساتھ۔

میں نے کبھی شیطان کے ساتھ دشمنی نبھانے کے لیے دنیا کو نہ تیاگا۔

جوگ، تیاگ کا مطلب تو یہ تھا کہ میرا اس کے ساتھ مقابلہ تھا۔

نہیں میرے پیارے سامع نہیں۔

مقابلہ اپنے جیسے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مقابلہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے جن کے ساتھ برابری ہو۔ میرا نفس اور شیطان کے ساتھ مقابلہ کہاں ہو سکتا ہے۔ دونوں ہی مجھ سے بڑھ کر ہیں۔ دونوں میرے وارے میں نہیں۔ سو میں نے یہی طریقہ نکالا ہے کہ اُن کو تسلیم کرنے سے ہی انکاری ہوں۔

میں نے اپنے تخیل کے سہارے پر اپنی آدھی زندگی آسانی سے گذار لی ہے۔ آسمان پر تیرتے دُھنکی ہوئی روئی جیسے سفید بادلوں کے گالوں پر لیٹ کر میں زمین کے دوسرے کنارے تک گئی ہوں۔ یہ سارے مظاہرِ فطرت انسان کی زندگی کے لیے کس قدر ضروری ہیں یہ میں نے ہر اس لمحے

محسوس کیا جب کبھی بادل کا کوئی ٹکڑا، صحرا کا منظر، ساحل کا دھانہ، خوشبو کا جھونکا مجھے حقیقت کی تلخی سے نکال کر کچھ وقت کے لیے کہیں دور لے گیا۔ جہاں تنہائی، چین اور سُکھ کا اک جزیرہ تھا۔ جہاں میں تھی، پرندے تھے، جھرنے اور آبشاریں تھیں، آوازیں اور خوشبویں تھیں۔ گندگی اور بدبو کا وجود انسان کے وجود کی وجہ سے ہے۔ اس دنیا کی ساری غلاظت اور گندگی ساری بیماری اور غربت انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔

میں نے اکثر انسانی بدن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے سوچا۔ دل کے نیچے سے اگر انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اوپر والے دھڑ میں پاکیزگی اور نیچے والے دھڑ میں گندگی رہ جاتی ہے۔ دل، پھیپھڑے، دماغ، آنکھیں، کان وہ تمام اعضاء ہیں جن کا تعلق خوبصورتی، جمال اور حُسن کے ساتھ ہے اوپر رہ جاتے ہیں۔ معدہ، مثانہ، آنتیں، سارے اعضاء جو گندگی اور غلاظت کا مسکن ہیں نیچے رہ جاتے ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے اسی پاکیزگی اور گندگی کے مرکب انسان کی پیدائش بھی بدن کے نچلے دھڑ میں ہوتی ہے۔ ناپاک پانی اور غلیظ خون کی آمیزش سے اللہ تعالی حسن و جمال اور معصومیت کا مرقع انسان کو پیدا کرتا ہے۔ ناپاکی کے ملاپ سے پاکیزگی کا جنم یہ اسی کے کمال ہیں۔ اس کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔ میں نے بارہا اس کی قدرتوں پر غور کیا اور اس کی موجودگی محسوس کی سردیوں کی طویل راتوں میں اکثر مجھے اضطراب کے دورے پڑتے اور میں کئی کئی گھنٹے روتے روتے گذار دیتی۔ آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی اور یوں لگتا کہ گویا سینہ اندر سے دُھل رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ انقباض ختم ہو گیا۔

شاید میرے گناہ بڑھ گئے تھے کہ میں رونے کی اس نشاط سے محروم ہو گئی۔ میرے ماضی میں کئی دوست تھے جو بچھڑ گئے آج بھی اُن کی یاد سینے میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کرتی ہے۔ ان دوستوں میں ایک ستارہ تھا۔ جو آسمان پر میرے گھر کے صحن میں شمال مغرب کی جانب رات گئے طلوع ہوتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ صرف سنتا تھا۔ وہ بہت اچھا سامع تھا۔ کبھی وہ مسکرا دیتا۔ کبھی رو پڑتا۔ اور کبھی مجھے ہلکی سی سرزنش کرتا۔ اس نے مجھے آسمان کے کئی راز بتائے۔ وہ اپنی دوستی کا پکا تھا۔ مگر پھر ہماری دوستی ختم ہو گئی کیونکہ میں ہوسٹل چلی گئی۔ بچپن کے دوستوں میں ایک کبوتری بھی تھی جو ہر سال گرمیوں میں گھر کے برآمدے کی پڑچھتی کے اندر انڈے دیتی اور بچے نکالتی۔ اور جب بچے چوں چوں کرتے تو میں چپکے چپکے اُن کو ملنے جایا کرتی۔ ان دوستوں میں ایک بہت بڑا بزرگ درخت تھا۔ جو اب بھی ہے اس کا نام ''برنا'' ہے۔ وہ

مجھے اپنے وجود میں پناہ دیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی ساری ساری طویل دوپہریں میں اس کے موٹے ٹہنے پر بیٹھ کر گذار دیا کرتی تھی۔ گرمیوں کی مختصر راتوں میں کھلے صحن میں لیٹ کر کئی بار میں نے پہلی کے چاند کی پتلی کمر کے ساتھ لٹک کر آسمان کی وسعتوں میں جھولے لیے ہیں۔ اور انہی مختصر راتوں کے پچھلے پہروں میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی رفتار سے گزرتے رات کے بڑے پرند کے پروں کی آوازیں سنی ہیں۔ اور انہی مختصر گرم راتوں میں، میں نے یہ بھی جانا کہ رات کے ایک خاص پہر سارے پرند اور جانور ایک دم، ایک ساتھ بولتے ہیں اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ شاید کوئی شفٹ بدلتا ہوگا اس پہر یہ میرے افسانے ہیں۔ ان میں، میں نے آپ سے مخاطب ہونے، آپ کو کچھ کہنے، سنانے اور کچھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہی جو میں نے دیکھا، جو میں نے سنا، اور جو میرے لاشعور سے ابھرا، وہ سب یہاں موجود ہے۔ میں ان تمام رشتوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری روح اور وجدان سے امتحان لیے، اور ان کی بھی جو میرے آنسوؤں میں میرے شریک رہے۔ ان کی بھی جنہوں نے میری مسکراہٹ پہ جان نچھاور کی، اور ان کی بھی جو میری فسردگی پہ آزردہ ہوئے۔ ان رشتوں کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے حوصلے آزمائے اور ان کی بھی جو حوصلے دیتے رہے۔ مجھے کسی کے مذہب سے کوئی بیر نہیں، ہاں کچھ چیزیں البتہ عجیب ضرور لگتی ہیں۔ جب کوئی حسین لڑکی اپنے حنائی ہاتھوں میں پھولوں کی تھالی تھام کے لے جاتی ہے اور وہ پھول کسی پتھر، مٹی، لکڑی یا سیمنٹ کے کسی بے جان بت کے قدموں میں ڈال دیتی ہے، تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ پھول تو لمس، بصارت اور شامہ کے لیے ہوتے ہیں۔ بے جان بت کو کیا معلوم اس کے قدموں میں کیا ہے۔ جب کچھ لوگ ان دیکھے اہرمن اور یزدان کی خاطر زندہ انسانوں کے گلے کاٹتے ہیں تو بھی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ لہو کا رنگ سرخ ہی کیوں ہے؟ کوئی اور بھی تو ہو سکتا تھا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے ان لوگوں سے مل کے جو ایک جار میں موجود مکس اچار میں سے لیموں، آم، گاجر، مولی اور ہری مرچ کا ذائقہ الگ الگ محسوس کر لیتے ہیں۔

میں نے کئی بار تحریر سے بغاوت کی ہے۔ اس سے انقطاع کے بعد نہ لوٹنے کا عزم کیا ہے، مگر ہر بار پلٹ کے اسی کی کوکھ میں اتری ہوں۔ لکھنا میری زندگی ہے۔ میں اس کے بغیر ادھوری ہوں۔ یہی سادہ سے بیانیے کی سادہ سی کہانی ہے۔ تنقید کی بھاری اصطلاحات، موٹے موٹے لفظ، عجیب و غریب نظریے، بڑے بڑے ادیبوں کے نام لکھ کے متن کو بوجھل بنانے کا کام مجھے کبھی نہیں بھایا۔ اور دوسری بات یہ کہ.....

مجھے اپنے مخاطب، اپنے قاری، اپنے سامع، اپنے ناظر سے دوری منظور نہیں۔ میرے پاس اور تو کچھ ہے نہیں، ہاں اس بات کا فخر ضرور ہے کہ میں کسی کا طفیلیہ نہیں ہوں۔ اب تک میں نے جو بھی حاصل کیا اپنے بوتے پر کیا۔ اپنی کوشش سے کیا۔ جس سے محبت کی اس سے کبھی صلہ نہیں چاہا۔ جس کی مدد کی، اس کی طرف کبھی پلٹ کے نہیں دیکھا۔ نفرتوں کے اتنے ادوار سے گزری ہوں کہ اب کسی سے نفرت نہیں رہی۔ حسد میں اس لیے نہیں کرتی کہ اپنی خواہشیں اپنے قدموں تک محدود رکھتی ہوں۔ یہ خودشناسی میرا سرمایہ ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھے کچھ چاہیے بھی نہیں۔

میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

جتن جتن ہر کوئی کھیڈے، تو ہارن کھیڈ فقیرا
جتن دا مل کوڈی ہوندا، ہارن دا مل ہیرا

منزہ احتشام گوندل

آخری خواہش

پھانسی سے قبل اُس سے اُس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اُس نے ایک عجیب وغریب خواہش کا اظہار کر کے سب کو چونکا دیا۔ میں گاؤں کی بڑ والی مسجد کے احاطے میں اُسی منبر پہ کھڑا ہو کے تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ جس منبر پر کھڑے ہو کر مولوی عبدالکریم نے خطبہ دیا تھا، آخری خطبہ ـــــ

سو پھانسی لگنے والے کی آخری خواہش کا احترام کیا گیا۔ بات مارچ، اپریل کے طوفان کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ اُس دن سارے کا سارا گاؤں اُس کی تقریر کے لیے اُمڈ پڑا تھا۔ گاؤں کی بڑ والی مسجد جس کے احاطے میں معمول کے طور پر جمعہ کے روز بھی چند نمازی ہوا کرتے تھے اُس روز بھری ہوئی تھی۔ لوگ مسجد کے احاطے سے باہر بھی اُمڈ آئے تھے وہ یہ جاننے کے سخت مشتاق تھے کہ وہ اپنی تقریر میں کیا کہنے والا ہے۔ اُس کو پولیس کی نِگرانی میں لایا گیا۔ بڑے خصوع وخشوع کے ساتھ اُس نے وُضو کیا اور اُس منبر کے سامنے کھڑا ہو گیا جس پر کھڑے ہو کر مولوی عبدالکریم گاؤں کے نمازیوں کو خطبہ دیا کرتا تھا۔ مولوی عبدالکریم اُس کا مقتول ـــــ

اُس دن سے عین ایک سال قبل اپریل کے مہینے میں گندم کی کٹائی کے بعد وہ گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا۔ جمعہ کا دن تھا غضب کی گرمی پڑ رہی تھی مگر بدن سہتا تھا۔ وہ گاؤں کی مسجد والی گلی میں داخل ہوا تو مولوی عبدالکریم منبر پر کھڑا خطبہ دے رہا تھا۔ مسجد کے احاطے کی کوتاہ چار دیواری اندر باہر کے بھیدوں کو محفوظ رکھنے میں ناکام تھی کہ مولوی کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی ”عورت فتنہ ہے۔ یہ آدم کو جنت سے نکلوانے والی ہے۔ خدا کا وعدہ ہے کہ روزِ قیامت جہنم کے اندر سب سے زیادہ عورتیں جائیں گی۔ کیونکہ عورت ناقص العقل اور ناقص الدین ہے۔ ایمان والے مردو! جس قدر ہو سکے عورت سے بچو۔ اِس سے گُریز کرو۔ یہ اپنی طرف مائل کرتی ہے اور مائل ہونے والوں کو گھائل کرتی ہے۔ اِس پہ نظر پڑ جائے تو فوراً استغفر اللہ کا وِرد کرو تا کہ تمہاری نِگاہ پاک رہے۔ یہ پاکباز مردوں کی

شان ہے ـــــ اُس سے آگے معلوم نہیں مولوی عبدالکریم کیا کیا کہتا رہا۔اُس نے نہیں سُنا ۔اُس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں اور کانوں کے اندر طوفانوں کا شور سما گیا تھا۔نہ جانے کیسے اُس کا دایاں ہاتھ نیچے کی طرف جھکا۔کچی پکی اینٹوں کی دیوار کے ساتھ نالی کے پاس اینٹ روڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔اُس نے ایک اینٹ روڑہ اُٹھایا اور گھما کر پورے زور کے ساتھ مولوی عبدالکریم کے منہ پر دے مارا۔

اینٹ روڑہ شاید مولوی عبدالکریم کی کنپٹی پر لگا تھا کہ پہلے تو مولوی سمجھ ہی نہ سکا کہ ہوا کیا ہے۔اُس کے بعد وہ سر پکڑ کر وہیں دوہرا ہو گیا نمازیوں نے فوراً مڑ کر دیوار کی اُس طرف دیکھا جدھر سے وہ روڑہ آیا تھا۔وہاں وہ کھڑا تھا۔بے حِس و حرکت۔

مولوی عبدالکریم کی ہلاکت ہو گئی تھی۔وہ چپ چاپ جا کر تھانے میں پیش ہو گیا تفتیش سے لے کر جیل اور پھانسی کی سزا کے فیصلے تک اُس نے زبان نہیں کھولی۔زبان کھولی تو اُس دن جس دن اُس سے اُس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔

آخری خواہش وہ بھی کیسی عجیب و غریب ـــــ

وہ منبر پہ کھڑا تھا۔لوگ بے تابی سے چُپ سادھے ہوئے تھے اور وہ اِضطراب سے چُپ تھا۔لوگ جاننا چاہتے تھے کہ اُس نے اتنے شریف النفس مولوی کو کیوں مارا۔ہر طرف سنّاٹا تھا۔آج بھی اُس دن کی طرح گرمی تھی لوگ اپنے اپنے پسینے کے اندر تر بتر دم سادھے بیٹھے تھے کہ اچانک اُس کی آواز اُبھری ـــــ

حاصل پور کی گندم پکی کھڑی ہے اور تم سارے اس کو چھوڑ کے یہاں بیٹھے ہو۔اِن دور دور تک پھیلے کھیتوں کے درمیان کہیں میرا بھی کھیت ہے اور اِن کھیتوں کے پار ایک قبرستان ہے جس میں میرا فضل حسین دفن ہے۔اُس کی دادی اور چاچے دفن ہیں اور اب باپ بھی دفن ہو جائے گا۔اِن کھیتوں کے اندر ہمارے پسینے دفن ہیں۔ہمارے خون ہماری ہڈیاں دفن ہیں۔ہماری محبتیں، ہماری محبتوں کے سجیلے موسم بھی اِن کھیتوں کے اندر دفن ہو گئے ۔اِس سنہری جھپک کی خاطر ہم نے وہ موسم بھی گنوا دیے جو اپنی کوکھ میں ملن اور ملاپ کی سوغاتیں اور پیغام لے کر آتے تھے۔اُس پر بھی خدا نظریں گاڑے بیٹھا رہتا۔خدا جو مسجد میں رہتا ہے۔مسجد خدا کا گھر جو ہے۔خدا اپنے نمائندوں کی زبان سے باتیں کرتا عورت اور محبوبہ سے نفرت کرنا سکھاتا۔خدا محبت کے خلاف کیوں ہوتا ہے؟ وہ چیخ پڑا اُس کی آواز پھٹ رہی تھی ایک نوجوان دوڑ کے اس کے لیے پانی لے آیا۔پانی کو اس نے غٹا غٹ پی لیا۔کچھ دیر تک ہانپنے کے انداز میں لمبے لمبے سانس لیتا رہا پھر بول پڑا۔

اس نے ہمارے سارے حسین موسم غارت کر دیے۔سردیوں کی طویل راتیں، گیدڑوں کی ہونکار، گنے کا رس اور گرم بستر کی حرارت ہمیں دعوتیں دیتی۔مگر ہم نے یہ ساری دعوتیں ٹھکرا دیں ہم کھیتوں کی مینڈھیں ٹھیک کرتے رہے۔ہم نکّے سے لے کر کھیت تک نہری پانی کی کھالیوں اور کاریزوں کے پھیرے لگاتے رہے۔تا کہ وہ سارا پانی سیدھا اُن کھیتوں تک جائے جنہوں نے ہمیں زندگی دینی تھی اور جو ہماری جنّت کی ضمانت تھے۔اور جن کے غلّے کا ایک حصّہ ہم نے مسجد کو دان کر کے خدا کو راضی کرنا تھا۔خدا مگر اِس پر بھی خوش نہ تھا۔

خدا کس بات پر خوش تھا ہم کبھی نہ جان سکے۔ہم درانتیاں پکڑے کھیت کاٹ رہے ہوتے تو وہ ہمیں دنیا داری کی غلاظت میں جکڑے ہوئے لوگ کہا کرتا۔اور پکارتا۔نماز کی طرف آؤ! فلاح کی طرف آؤ! ہم درانتیاں رکھتے اور چل پڑتے۔ہم خدا کے لیے جی رہے تھے اور اُسی کے لیے مر رہے تھے کہ لوگو میرا، فضل حسین، مر گیا ـــــ اُس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔مسجد کی کوتاہ دیوار کے پار عورتوں کے درمیان سہارا لے کر کھڑی اُس کی بیوی نے بھی چیخیں مارنی شروع کر دیں۔

لوگوں میں چہ میگویاں شروع ہو گئیں۔ایک نوجوان اٹھا اور بھاگ کر پانی کا کٹورہ لے آیا مگر اس نے اب کی بار پانی قبول نہیں کیا۔وہ اپنے ہی آنسوؤں کے ہڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔اب اس کی آواز سرگوشیوں میں بدل گئی تھی۔وہ بھی گرمیوں کی کھٹی میٹھی دوپہر تھی جب میرا فضل حسین مسجد سِپارہ پڑھنے گیا تھا۔اور جب دیر تک نہیں لوٹا تو میں خود لینے گیا۔لوگو جانتے ہو جب میں اپنے آٹھ سال کے فضل حسین کو لے کر مسجد سے نکلا تو وہ میری انگلی پکڑے چل نہیں رہا تھا۔اس کی لاش میرے بازوؤں میں تھی۔وہ مولوی عبدالکریم کے پاس صبح کا سِپارہ پڑھنے گیا تھا۔

لوگو! جانتے ہو ناں جس دن مولوی عبدالکریم کا جنازہ اٹھا اُس دن میرے فضل حسین کو مرے ہوئے بیالیسواں دن تھا۔وہ میرے، فضل حسین، کے مرنے کے صرف بیالیس دن بعد جمعہ کے خطبے میں تم سارے گاؤں والوں کو عورتوں کے خلاف بھڑکا رہا تھا ـــــ

صرف بیالیس دن بعد

صرف بیالیس دن بعد

سرگوشیوں کا بھی دم ٹوٹ گیا تھا۔لوگوں کی آنکھوں کے آگے سے سارے پردے اٹھ گئے تھے۔سب دم بخود تھے کہ اچانک جنوب سے سرخ طوفان اٹھا اور آناً فاناً ہر طرف پھیلتا چلا گیا ـــــ

تقلیب

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے میرے اندر اکتاہٹ بھر دی۔ ریت اور مٹی کے اس لامتناہی صحرا میں یہ کام مشکل اور طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ دن بھر کی محنت کو رات کے وقت چلنے والے گردباد کے یہ جھکڑ تہہ و بالا کر دیتے تھے۔ بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد ڈھونڈ نکالے گئے سراغوں کو ریت پھر برابر کر دیتی تھی۔

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ اس کی طرف دیکھنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے اور اگر کسی وقت کسی طرح میں یہ فرض ادا نہ کر سکا تو قضا واجب ہو جائے گی۔ ''ماریہ مارغریطہ'' وہ اپنے کام میں شدت کے ساتھ منہمک ہے، برش کے ساتھ بڑی نزاکت سے مٹی کو ہٹا کر آثار کے قریب سے قریب تر ہوتی ہوئی____

کیا میں ان کئی ہزار سال پرانی دبی ہوئی لاشوں جتنا اہم ہو سکتا ہوں کہ یہ لڑکی اپنے پورے انہماک کے ساتھ مجھے کھوجتی ہوئی میرے قریب سے قریب تر ہوتی جائے اور پھر کسی لمحے اچانک میرے پورے وجود کا کوئی ہزارواں حصہ دریافت کر کے خوشی سے ایک فلک شگاف چیخ بلند کرے ____ لیکن مجھے معلوم ہے۔ میں آئزک سالومن آج کا جیتا جاگتا، مکمل، پورے وجود کے ساتھ ہو کر بھی اس کے لیے اتنا اہم نہیں جتنی وہ کئی ہزار سال کی دبی ہوئی پرانی لاشیں ہیں۔ وہ نہ ہی میرے اتنے قریب آ سکتی ہے اور نہ کبھی میری دریافت پر ایسی چیخ بلند کر سکتی ہے۔

''ماریہ مارگریٹ'' جسے میں ''ماریہ مارغریطہ'' کہتا ہوں۔ وہ اس کا برا نہیں مناتی۔ کیوں کہ جب وہ مجھے ''اسحاق سلیمان'' کی بجائے آئزک سالومن، پکارتی ہے تو مجھے بھی برا نہیں لگتا۔ دنیا کی کسی بھی عورت سے زیادہ خوب صورت ہے کیوں کہ میری نگاہ، دل اور شعور کی طلب ہے اور میری

روح کو پسند ہے۔ اس کے سیاہ اونچے نیچے ترشے ہوئے بالوں کو میں نے کم ہی سلجھے ہوئے دیکھا ہے۔ زیادہ تر اس کے بال اُلجھ کر اس کی کمر اور شانوں پر پھیلے رہتے ہیں۔ جنہیں کبھی کبھار وہ پکڑ کر اکٹھا کر کے کسی چٹکی کے اندر جکڑ دیتی ہے۔

میں اس کے بالوں، لباس اور بدن کے ساتھ اس لیے بھی زیادہ موانست محسوس کرتا ہوں کہ وہ میری طرح ان کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی۔ بس جو ہے سو ہے کی بنیاد پر وہ ان چیزوں کے ساتھ قدرتی تعلق کو نبھائے جا رہی ہے۔ اس کا ماتھا کشادہ اور قد لمبا ہے۔ بغیر آستینوں کی قمیص میں سے اس کی بانہیں کسی طرح سے بھی کسی عورت کی بانہیں محسوس نہیں ہوتیں۔ گردن کے نیچے اور ناف سے قدرے اوپر میں اس کے عورت ہونے کے آثار ڈھونڈتا ہوں تو اپنی سوچ پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ مجھے اس کے بارے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ وہ بہت محترم القام ہے۔ مگر کیا جس عورت کی بانہوں کی ساخت اور گردن کے نیچے کا حصہ پکار پکار کر اُس کے عورت ہونے کی گواہی دے اس کا احترام کیا جا سکتا ہے؟؟؟

میں پھر اس کی طرف دیکھتا ہوں اور ہر دفعہ ایک نئی سوچ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ پوری شدت کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہے۔ اس کی استخوانی انگلیاں تیزی کے ساتھ ایک فوسل____ کے اوپر چل رہی ہیں جس کو مکمل دریافت کرنے میں وہ کامیاب ہونے والی ہے۔ باریک گرد کی تہہ اس کے بالوں، ماتھے، پلکوں، گردن، حتیٰ کہ پورے بدن پر جمی ہوئی ہے۔

وہ کیا سوچتی ہے۔ میں نہیں جانتا۔ اس وقت جب کہ وہ اپنے فوسل کے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے دماغ میں کیا ہے۔ میں نہیں جانتا۔ میں بھی تو اس کی طرح جیالوجسٹ ہوں____ آرکیالوجسٹ ہوں پھر میں زمین کی بجائے اس کے شعور اور لاشعور کی تہیں کیوں کھود رہا ہوں؟ شاید میں اس جتنا کمیٹڈ نہیں۔ مجھے اس کے لاشعور تک جانے کے لیے کئی ہزار سال پیچھے ماضی میں جانا پڑے گا۔ تب میں اس کے لیے تھیسز Thesis ہو سکتا ہوں۔ کسی سیلاب، زلزلے، قدرتی آفت میں تباہ ہو جانے والی کسی قدیم بستی کا باشندہ، جس کی سڑی بسی ہڈیوں اور بالوں کے کسی بچے کھچے حصے پر وہ تحقیق کر کے ____ اپنے استخوانی بدن کی باقی ماندہ طاقت بھی خرچ کر ڈالے۔

''ماریہ مارغریطہ'' دنیا کی کسی بھی عورت سے زیادہ خوب صورت، اپنے کام میں منہمک ایک ایسی ولی ہے جس کے باطن کے سبھی دریچے روشن ہیں۔ اُس کے ہاتھ میری کمزوری لگ گئی ہے۔ میں چپ کے آگے ہار جاتا ہوں اور وہ چپ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ میرے ضبط کی طنابیں

ٹوٹنے کو آ جاتی ہیں کہ وہ ڈھیل دے دیتی ہے۔ وہ ارتکاز جو ہزاروں سال قدیم فوسلز اور دفن جسموں نے حاصل کرلیا ہے۔ اس پر اصل میں میرا حق تھا۔ اتنی باریکی اور گہرائی کے ساتھ اُس کی توجہ کی مجھے ضرورت تھی مگر میں تو ایک عام سا زندہ جیتا جاگتا انسان ہوں۔ جو اس کے لیے کسی بڑی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا۔ زمین کے نیچے ہزار ہا معدنیات، پرانے شہر، تہذیبیں، مذہب، ثقافتیں اور انسان قید ہیں مگر جذبے نہیں ہیں۔ جب اس کو جذبوں کی ضرورت ہوگی تو پھر یہ کیا کرے گی؟ پھر تو اس کو لازمی میرے وجود کے اندر ہی نقب لگانی پڑے گی تب مجھ پر ایک راز کھلتا ہے کہ جذبے صرف جانداروں کے اندر ہوتے ہیں۔ بے جان عناصر کے اندر خواص تو ہو سکتے ہیں جذبے نہیں۔

میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ اس عورت کو سوچنے میں کیوں گزار دیتا ہوں جس کی بظاہر مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے اس کے متعلق اتنا سوچا ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے لگا کہ میں ایک نکتے کے اندر سما گیا ہوں مگر میرا یہ سمٹاؤ بھی اس کی ذات کے طے شدہ قرینوں کے اندر کوئی بھنور نہیں لا سکا ہے۔

کیا میں اپنی ناکامی پر دل برداشتہ ہوں؟؟

کیا زندہ انسان کی تسخیر جمادات و نباتات سے زیادہ مشکل ہے؟؟

وہ آخر کیوں میری طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ مجھے اس کے فوسلز سے رقابت محسوس ہونے لگی ہے اور عنقریب میں اس واہیات کام کو ہی چھوڑ دوں گا۔ اونہہ، بوسیدہ ہڈیاں اور گلے سڑے چیتھڑے جنہیں دیکھ کر ہم یوں خوش ہو جاتے ہیں کہ جیسے خلا کے اندر کوئی نیا سیارہ دریافت کرلیا ہو۔

رات کے وقت اس صحرا کے اندر لگے کیمپوں میں روشنی ناکافی مگر بھلی لگتی ہے۔ ہاں تو آئزک سالومن تم کیا سوچ رہے ہو؟ وہ میرے قریب بیٹھتی ہوئی پوچھتی ہے۔ اس کے بدن سے کسی کریم یا لوشن کی خوشگوارسی خوشبو آتی ہے۔ شاید وہ پورے جسم کو سکرب کر کے صاف کر کے آئی ہے۔ صحرا میں پانی نہیں ملتا اور جو ہمارے پاس ہے وہ نہانے کے لیے استعمال کریں تو پیاسے مر جائیں۔ میں ایک عجیب سی رقابت کے ساتھ سوچتا ہوں اس کے نتھنے سکیڑنے کی وجہ بالکل بجا ہے۔ جب دو لوگ نہائے بغیر اپنی اپنی بدبو میں سگندھ کر پاس بیٹھے ہوں تو ایک دوسرے کے بدن کی ناگوار بو کو قطعاً محسوس نہیں کر پاتے۔ جب اُن میں سے ایک نہا دھو کر صاف ہو جائے تو دوسرے کے گندے بدن کی بو فوراً اپنے مخرج کا پتا دیتی ہے۔ میں دور کھسکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تمہیں خود کو صاف نہیں کرنا چاہیے تھا یا پھر مجھے بھی نہا لینا چاہیے وہ پراسراری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتی ہے۔

دو متضاد حالتیں آپس میں جڑتی ہیں۔ کیا تم نے کبھی نہیں پڑھا؟

میری ناک ان اصولوں سے بالاتر ہے۔ اس کے اپنے فیصلے ہیں۔ میں جواب دیتا ہوں۔ وہ چپ رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ ویسے بھی گفتگو کی ضرورت نہیں۔ جب تعلق ہر طرح کی منطق سے آزاد ہو جائے تو پھر بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھ سے لاتعلق رہنا یا لاتعلقی اختیار کیے رکھنا اس کی مجبوری ہے، عادت یا پھر مشغلہ یہ ابھی طے نہیں ہو سکا۔ دفتر میں بیٹھی باقی لوگوں کے ساتھ ہنس رہی ہے۔ فقرے اُچھال رہی ہے۔ اُن سے لطف اندوز ہو رہی ہے مگر جیسے ہی میں دفتر میں قدم رکھتا ہوں معاملہ الٹا پڑ جاتا ہے۔ وہ مصروف ہو جاتی ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتی ہے اور کچھ نہیں تو کسی نہ کسی کو فون لگا کر لمبی بات شروع کر دیتی ہے ورنہ کمپیوٹر تو ہے ہی۔

پرانے کھاتے، ڈرافٹ، طویل بل اُسے یاد آ جاتے ہیں کہ اُس نے بنانے ہیں۔ چلیں میرے جانے پر اُس کے ادھورے کام تو مکمل ہوتے ہیں یہ خیال بھی میرے لیے اطمینان بخش ہے۔ بہرحال یہ تو ماننا پڑے گا کہ وہ بڑے سلیقے سے اُس وقت کو میری طرف سے لاتعلق رہ کر استعمال کر لیتی ہے جب تک کہ میں اٹھ نہیں جاتا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے اٹھنے کے فوراً بعد ہی وہ ایک طویل ٹھنڈا سانس لے کر اپنی میز کے اوپر سر ٹکا کر سو جاتی ہوگی۔

اُس نے صرف ایک ہی بار پوچھا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔''

اور جواب نہ ملنے پر اپنے دھیان میں مگن ہوگئی وہ ہمیشہ سے ایسی ہے۔ میں اٹھ کر چل پڑتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے نہیں بلائے گی، نہ رکنے کو کہے گی۔ بس ایک بار مجھے جاتے ہوئے دیکھ کر منہ دھیان ہو جائے گی۔ پھر بھی میں خود کو اس کے لیے مجبور پاتا ہوں۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر رہ نہیں سکتا۔

مجھ میں بھی عجیب عادت ہے۔ میں اس کے ارتکاز کے دائرے میں آنے کے لیے تڑپتا ہوں مگر جونہی وہ ملتفت ہوتی ہے میں کترا کے نکل جاتا ہوں۔ جیسے ابھی ہوا ہے۔ وہ میرے پاس آ کے بیٹھی ہے ممکن ہے وہ اس لمحے کسی جذبے کے زیر اثر ہو مگر میں اٹھ کر آ گیا ہوں اور اب دیر تک سلگتا رہوں گا۔

رات کے وقت چلنے والی آندھی اور ہوا دن بھر کے کھودے اور نکالے گئے آثار کے اوپر ریت کی چادر ڈال دیتی ہے۔ رات بھی کیسی پردہ پوش ہے۔ زمانے کی کوکھ میں چھپی کہانیوں کی عریانی

کو برداشت نہیں کرتی اور راتوں رات اُن کے اوپر چادر سرکا دیتی ہے مگر انسان کی عیب جوئی اور پردہ دری کی عادت کا کیا کیجیے کہ زمانے اور تاریخ کے ہر راز کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ ہم ایک قدیم ترین دفن شدہ شہر کی باقیات ڈھونڈ رہے تھے اور ایک شہر میرے وجود کے اندر ڈھے رہا تھا۔

رات کا وقت صحرا میں بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ ایک عجیب و غریب سی بدن کی رگوں میں سرایت کرتی ہوئی ٹھنڈک دور دور تک پھیلی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ یوں ہی جب وہ میرے قریب آ کے بیٹھ گئی تھی تو میں نے اُس سے پوچھا:

''ماریہ'' کیا تمھیں یہ سخت غیر جمالیاتی کام ہی ملا تھا کرنے کو؟''

''تو تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

''تم!!!''

میں گڑبڑایا۔ بہت سے کام ہیں۔

''مثلاً ؟؟؟''

مثلاً یہ کہ تم کاغذ کے پھول بناتیں، کپڑوں پر کڑھائیاں کرتیں، کھانے پکاتیں، اچار ڈالتیں، مربے، جام، چٹنیاں تیار کرتیں۔ گرمیوں کی سبزیاں سردیوں میں کھانے کے لیے خشک کرتیں۔ کتنے بہت سے کام ہیں جو ایک نرم و نازک عورت ہی کر سکتی ہے۔ جب سرخ رس بھریوں کو ایک عورت کی لانبی نازک انگلیاں چاقو کے ساتھ کاٹ رہی ہوتی ہیں تو میں اُس منظر میں گندھ جاتا ہوں۔ تب چاقو جیسا مشکوک ہتھیار بھی ان انگلیوں اور رس بھریوں کی مشترکہ جمالیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر کبھی میں اُس منظر کے اندر چاقو اور رس بھریوں کے ساتھ مرد کی انگلیاں دیکھوں تو برداشت نہ کر پاؤں اور مجھے لازمی طور پر قے آ جائے۔ میں رک گیا۔

''تمہاری جمالیات بھی عجیب ہے آئزک سالومن! عورت کی انگلیاں صرف کاغذ کے پھول بنانے، اچار اور سالن کے لیے سبزیاں کاٹنے، کپڑوں پر کڑھائیاں کرنے کے لیے تمہارے نزدیک آخری معیار ہیں۔ وہ مٹی کو گوندھ کے برتن بھی بناتی ہے۔ آٹا گوندھ کے روٹی پکاتی ہے۔ اس کے ہاتھ زندگی کا بیشتر حصہ برتنوں، کپڑوں، آٹے اور سبزیوں میں الجھے رہتے ہیں۔ یہ ہاتھ کبھی تشدد کے لیے نہیں اٹھتے۔ نہ ہی کبھی ٹریگر دباتے ہیں۔ بلکہ

زہر کی معمولی سی مقدار کو منہ تک لے جاتے ہیں اور ساتھ ہی پانی بھی دیتے ہیں۔ یہ سب اعمال جو عورت کے ہاتھ سرانجام دیتے ہیں۔ جمالیات ہی جمالیات ہے۔ عورت کا دل اور اس کے ہاتھ کبھی کوئی غیر جمالیاتی کام نہیں کرتے۔ ہاں مگر وہ چند ایک افعال جو غیر جمالیات کے زمرے میں آتے ہیں وہ بھی مرد کرواتا ہے۔ وہ عورت کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف لے جاتا ہے جہاں وہ نہیں لے کے جانا چاہتی۔ وہ اس سے وہ کرواتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتی۔''

میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ میں کیوں شرمندہ ہو رہا ہوں؟ یہ میرا احتساب تو نہیں ہے۔ ہاں یہ میرا احتساب ہی ہے۔ میں اپنی صنف کا نمائندہ ہوں۔ وہ اپنی صنف کی نمائندہ ہے۔ مگر وہ اس لیے منفرد ہے کہ وہ کوئی بھی کام صنف مخالف کو رجھانے، بہلانے، کے لیے نہیں کرتی۔ جبکہ مرد اور عورت میں سے ہر دو کے خفی جلی اعمال و افعال ایک دوسرے کو رجھانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ پھر ہم بے ترتیب سی گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔

میری جمالیات کے پیمانے انوکھے اور الگ ہیں۔ میں نے اپنے ایک استاد کو ایک بار قمیص کو پتلون سے باہر نکال کر پھرتے دیکھا تھا تو میری حِس جمال کو سخت دھچکا لگا تھا۔ مجھے دایہ گیری، نرسنگ، مساج، بیوٹی پارلر اس طرز کے پیشوں سے نفرت ہے۔ یہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔

''اور اگر مردوں کو نہلانے اور کفنانے کا پیشہ مل جاتا تو کیا کرتی ؟؟؟''

''اگر یہ آخری آپشن ہوتا تو میں یقیناً خودکشی کر لیتی۔''

زندہ جسموں، دھڑکتے اجسام سے نفرت کرنے والی، ہزار ہا پرانی دبی ہوئی لاشوں کی متوالی۔ گہرے دکھ سے لبریز سانس خارج کرتے ہوئے میرے ہونٹ بے ساختہ سکڑ جاتے ہیں میں کیوں اس کی جستجو میں ہلکان ہوتا ہوں۔

وہ کسی دوسری تہذیب کی پروردہ لڑکی ہے۔ میں اُسے اپنے نفسیاتی تعصبات کے دائرے میں رکھ کر دیکھتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ میں اس معاملے میں بے بس ہوں مگر مجھے یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ میرا اُس پر اختیار کیا اور کتنا ہے۔ وہ میرے جتنی پڑھی لکھی، مجھ سے بہتر سمجھ اور شعور رکھنے والی اور مجھ سے بڑھ کر اپنے کام کے ساتھ مخلص ہے مگر اس کے باوجود شاید میرے دماغ کے خلیوں میں کہیں نہ کہیں یہ خیال چھپا بیٹھا ہے کہ وہ ایک عورت ہے۔ وہ اگر عورت

ہے تو پھر بھی میرے معاشرے کی عورت تو نہیں ہے جس کو ہم لوگ ہانک کر، پالتو مال بنا کر اور روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کے احسانات اس کے اوپر سوار کر کے اس کو عزت اور شرف بخشتے ہیں اور وہ دبی رہتی ہے۔ ہماری ممنونِ احسان رہتی ہے۔

ہمارے معاشروں کے اندر لڑکی کو جنس سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ جنس ایک غلیظ اور گندی چیز ہے یہ ان کے دماغوں میں ڈالا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس لڑکوں کو ہر طرح کی جنسی آزادی دی جاتی ہے۔ مرد شادی سے قبل بھی ہر طرح کی سہولت اور راحت کا حق دار ہے محض اس لیے کہ اس نے ماں کے پیٹ سے مرد کے روپ میں جنم لیا ہے۔ مگر لڑکی شادی سے قبل ہر طرح کی راحت سے محروم رکھی جاتی ہے۔ یہ پابندی اس پر سماج نے لگائی ہے۔ وہ اچھا لباس نہیں پہن سکتی، وہ اچھا کھانا نہیں کھا سکتی۔ وہ بناؤ سنگھار اور زیور نہیں پہن سکتی۔ وہ اپنی گاڑی نہیں لے سکتی۔

وہ یہ تمام کام شادی کے بعد کر سکتی ہے۔ مرد کی موجودگی اس کے لیے سرٹیفکیٹ ہے اور یہ معاشرہ پانچ ہزار سال سے ان تضادات کے اندر سانس لے رہا ہے اور ''ماریہ مارغریطہ'' میرا اُس پر بس اس لیے نہیں چلتا کہ وہ جس معاشرے کی پروردہ ہے وہ عورت کو بھی جذبات اور احساسات سے بھرپور ایک عقل مند انسان مانتا ہے۔ جہاں عورت بجائے خود ایک فرد ہے۔ اپنی مرضی کی مالک اور اپنے فیصلوں میں آزاد اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی ہے۔ وہ خود شناس اور خود آگاہ ہے۔ وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتی۔ اس نے کبھی بھی یہ نہیں سمجھا کہ اس کا یہ بدن صرف اس لیے بنایا گیا ہے کہ زمین پر موجود خدا کی اعلیٰ ترین مخلوق کو راضی کرنے کے کام آئے۔

اس کی حیاتیاتی ضروریات کیا ہیں؟ کب شروع ہوتی ہیں؟ وہ کس طرح پوری کرتی ہے؟ ان معاملات میں وہ کسی کی شمولیت کو ضروری نہیں سمجھتی۔

ہاں ہمارے قدیم شہر کے آثار کھودنے کے اس پراجیکٹ کے پہلے ہفتے کے صحرائی جشن والی رات کو میں اپنے جینڈر کے تعصب میں جل رہا تھا۔ جب رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے رات گزارنے کے لیے ہمارے ایک اور ساتھی جودکیڈیرو کا انتخاب کیا تھا۔

جودکیڈیرو کا تعلق فلسطین سے ہے۔ وہ ایک خوب صورت نوجوان ہے۔ آج سے دو نسلیں قبل اس کے آباؤ اجداد نے جرمنی سے ہجرت کی تھی اور فلسطین میں آ کے آباد ہو گئے تھے۔ وہ ان یہودیوں کی بچی کھچی نسل میں سے تھے۔ جو ہٹلر کی نسل کشی میں مارے گئے تھے۔ جودکیڈیرو کے والد اسرائیل کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں

ہوتی کہ جیالوجی کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہم تمام لوگوں کا تعلق پڑھے لکھے اجداد کے ساتھ ہے۔ مگر ہم اپنے نسلی تعصبات سے الگ ہو کر جینے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ کوشش کہاں تک کامیاب تھی اس کا ادراک نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنا میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے علاقائی اور ثقافتی تعصب سے خود کو اس حد تک آزاد کرا لیا تھا کہ جب جشن کی رات ماریہ، جودکیڈیرو کے ساتھ شب بسری کے لیے چلی گئی تو میں نے اس کے بارے میں کچھ غلط بھی نہیں سوچا۔ ایک عام مرد کی طرح میرے دماغ نے اس کو بدکردار یا فاحشہ کے القابات نہیں دیئے۔ بلکہ وہ تب بھی اپنے تمام تر احترام کے ساتھ میرے دل میں جلوہ زن رہی کیوں کہ وہ اپنے ثقافتی اور اخلاقی قاعدوں کے اندر ٹھیک تھی۔ میرے پاس ایسا کیا حق تھا کہ میں اس کے کسی بھی عمل کا برا مناتا۔

کوئی اپنے سماج کے اخلاقی قاعدوں کے مطابق کوئی بھی کام کر رہا ہو۔ کسی دوسرے کے سماج اور مذہب کے قاعدوں کے مطابق وہ جرم ہی کیوں نہ ہو اس کے کام کے اندر دخیل ہونے کی اجازت کوئی بھی اخلاقیات نہیں دیتی۔ میں کئی دن اداس رہا۔ میرے اندر اس وقت ماریہ کے لیے احساسِ ملکیت جاگ رہا تھا۔ وہ میرے لیے دنیا کی خوب صورت ترین عورت تھی کسی اور مرد کے لیے نہیں۔ کیوں کہ کسی بھی جسم پرست مرد کے لیے وہ کسی کشش کی باعث نہیں بن سکتی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا میں اس کے جسم کی خواہش سے آزاد تھا؟؟؟

جسم کا جسم کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ میں جب بھی سوچتا ایک بدن توڑ کسمساہٹ میرے اندر دوڑ جاتی۔ ذنوبہ الخلیلی کی نرم مخروطی بھری ہوئی باہنیں اور بولتا ہوا رس دار جسم اس کے شہد رنگ بال اور چھوٹی سی ناک کے نیچے ہلکا سبز نرم رواں، میرے سینے، بازوؤں اور ہونٹوں کے اندر اس کا لمس کہیں اٹک گیا تھا۔ وہ پہلا اور آخری لمس جو ادھورا بھی تھا اور مکمل بھی۔ مگر میں وہاں سے کیوں بھاگا تھا؟؟؟ اور اگر بھاگا تھا تو آج تک اس احساس جرم سے نکل کیوں نہیں پایا ہوں جو مجھے اس کو یوں چھوڑ کر بھاگ آنے پر ہے۔

وہ میرے سماج کی اخلاقیات تھی جس نے مجھے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ سفید جالی دار فراک جس کے اندر سے اس کی تراشیدہ کمر اور پیٹھ شفاف ہو کر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے نظر کو اسکی کمر پر گرایا اور پھراتا ہوا اس خوب صورت مخروطی انگلیوں والے ہاتھ تک لے گیا جو کہ یمن کی سرحد پر واقع تیل کے کنوؤں کے مالک میرے باپ کے ہاتھ میں تھا۔ زنوبہ میرے باپ کی چوتھی بیوی تھی۔ ہمارے سماج میں عورت ایک لایعنی سی چیز ہے۔ محض بدن، صرف بدن، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس

بدن کے اندر دماغ بھی ہے۔ وہ کبھی دماغ سے نہیں سوچتی۔ اس کو ایسی سوچ کبھی دی ہی نہیں گئی۔ جب وہ گود میں ہوتی ہے تو اس کو روایت پسندی، وفاداری، اطاعت اور تسلیم و رضا کے اسباق سکھائے جاتے ہیں۔ مرد چاہے وہ کسی بھی رشتے کی شکل میں ہو اس کے گھنے سایہ دار شجر کی پناہ میں اس کی تسکین کی جنت اس کو اچھی طرح سمجھا دی جاتی ہے اور پھر وہ محض ایک بدن بن کر رہ جاتی ہے۔ مجھے اپنی پاکستانی کلاس فیلو لیلیٰ کے ساتھ وہ مکالمہ آج بھی یاد ہے اُس نے بتایا تھا۔ ہمارے ہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہاں مڈل ایسٹ میں تو پندرہ سال کی لڑکی سے شادی کی جاتی ہے اور تیس سال کی عمر میں اس کی ریٹائرمنٹ ہو جاتی ہے یعنی طلاق دے دی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب یہ ناقابل استعمال ہے۔ ہمارے ہاں کی عورت کو اپنی کم دماغی، کم عقلی اور جہالت پر فخر ہے۔

''جانتے ہو ہمارے ہاں کی عورتیں کس طرح کی باتوں پر فخر محسوس کرتی ہیں؟

وہ پوچھتی ہے تو میں سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ شروع ہو جاتی ہے۔

''میرا میاں تو مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتا۔ کام والی رکھ کے دی ہوئی ہے۔

گھر کے کام کاج، دال چاول، سبزی، کپڑا لتا، زیور برتن، ہر چیز لا کے دیتا ہے۔ مجھے کبھی باہر نہیں جانے دیا۔''

گھر میں رہ رہ کے بھی پاکستانی عورت کے عقل و دانش کی یہ حالت ہے کہ گھر کا انرجی سیور ہی جل گیا ہے تو میاں بے چارہ سرگودھا سے چھوٹتا ہے اور سات گھنٹے کا سفر کر کے ملتان پہنچتا ہے اور جا کے انرجی سیور تبدیل کرتا ہے۔ کیوں کہ قطار اندر قطار بچے پیدا کرنے والی بی بی کو انرجی سیور بھی بدلنا نہیں آتا۔ کنڈی ٹوٹ گئی میاں کا انتظار ہے۔

واش روم کی ٹونٹی کھوچل ہو گئی ہے۔ میاں آ کے تبدیل کرے گا بجلی کے بورڈ میں ایک ساکٹ خراب ہے۔ میاں آ کے تبدیل کروائے گا یا کرے گا۔ جوسر کا سوئچ کام نہیں کر رہا۔ میاں کا انتظار ہو رہا ہے۔ بجلی کا بل جمع کروانا، بچوں کے سکول، داخلے، آٹا پسوانا، یہ تو خیر کام ہی بہت بڑے بڑے ہیں جو کہ عورت بے چاری بھلا کہاں کر سکتی ہے۔ یہ سارے کام مرد ہی کرے گا۔

''ماریہ مارغریطہ'' کو میں دیکھتا ہوں۔ وہ سارے نام نہاد مردانہ ٹائپ کام خود کر لیتی ہے۔ بیگ کی زپ کو ٹھیک کرنا، جوتے کی مرمت، بجلی کے چھوٹے موٹے سامان کی مرمت وہ خود کرتی ہے۔ اس نے محض بدن پر اکتفا نہیں کیا ہوا وہ اپنے دماغ کو بھی بروئے کار لاتی ہے۔ حتیٰ کہ زخموں کی مرہم پٹی، بیماروں کا علاج، کپڑوں کی سلائی اور اس طرح کے ہزاروں کام اس کی دلچسپی کے علاقے

میں داخل ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک ارثماطیق ہے۔

زمین کی تہوں کو کھود کھود کر آثار کے قریب ہوتی ہوئی کھدائی کے تیسرے ہفتے جا کر ایک دوپہر کو اچانک ماریہ کی بلند آہنگ چیخ نے ماحول کی کھٹ کھٹ کو چونکا دیا۔ خوشی سے اس کی نسیں تن گئی تھیں۔ اس کی کھرپی اور برش کے نیچے کسی انسانی ہڈی کے آثار تھے۔ اس چیخ کے اگلے چند گھنٹوں تک ہم ایک ننھے انسانی ڈھانچے کے اوپر سر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ کوئی چھوٹا سا بچہ تھا جس کی ہڈیوں کا کیلشیم بھی ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ شاید تین چار سال کا کہ موت نے اس کو آ لیا۔ ٹیم کے نگران مسٹر ایرک نے اس کے ننھے سے ہاتھ کی ہڈیوں کو اوزار کے ساتھ چھوا انگلیوں کے سروں پر ناخن نہیں تھے۔

ہوں ں ں ں، ناخن گل گئے ہیں۔ مٹی میں مل گئے ہیں۔ کیوں کہ بچے کی عمر زیادہ کم تھی۔ ابھی کاربن پختہ نہیں ہوا تھا۔ کاربن پختہ ہو جائے تو پھر ناخن کا کیلشیم نہیں گلتا۔ وہ بریف کرتے رہے اور میں ذنوبہ الخلیلی میں ڈوب گیا۔ میں ماضی کی سرزمینوں میں ڈولتا رہا۔

وہ صحرا کی بگولے اڑاتی آندھی والی دوپہر تھی۔ جب میں نے ذنوبہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے ہلکے سے کھلے دروازے کے اندر جھانکا تو ششدر رہ گیا۔ ذنوبہ کمرے میں تنہا تھی اور اس کا تین ماہ کا بچہ سعد سلیمان اس کی خوب صورت سنہری بھری ہوئی چھاتی سے چُسک چُسک دودھ پی رہا تھا۔ ذنوبہ نے ایک دم نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا تو مسکرا دی۔ مجھے شہہ ملی تو میں نے دھیرے سے اس کا دروازہ بند کیا اور آہستہ سے چلتا ہوا اس کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ذنوبہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ میرے قرب سے گھبرا رہی تھی ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ہاں مگر اس کی نظریں سعد کی طرف جھک گئیں جو دھڑا دھڑ اُس کا شیر اپنے اندر اُتار رہا تھا۔ میں نے بے اختیار سعد کے ننھے سے ہاتھ کو پکڑ لیا جس کو اس نے ذنوبہ کی چھاتی پر رکھا ہوا تھا۔ میں کیسے فرار اختیار کرتا اس عورت سے جو میری ہم عمر تھی مگر میرے باپ کی بیوی تھی۔ میں نے سعد کے ہاتھ کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ اس کی ننھی ننھی انگلیوں کے آگے بہت ہی نرم، خوب صورت موتیوں جیسے ناخن جڑے تھے جو کسی حد تک بڑھ آئے تھے۔ ایک خیال جانے کیسے میرے دماغ میں جا گزیں ہوا۔

''ذنوبہ!!!''

''ہوں ــــــ''

''سعد کے ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ جس طرح ہاتھ چلاتا رہتا ہے کسی دن

تمہیں زخمی کر دیں گے۔''

میری نظر یہ بات کہتے ہوئے اس کی چھاتی کی طرف اُٹھ گئی۔

اُس نے کسمسا کر سعد کا ہاتھ میرے ہاتھ سے لے لیا اور ہولے سے دبایا۔

''یہ کام بہت مشکل ہے۔''

وہ بولی۔

''بچہ پیدا کرنا آسان ہوتا ہے ذنوبہ؟''

میں بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''بچہ پیدا کرنا آسان ہے مگر بچے کے ناخن کاٹنا مشکل۔ عجیب بات ہے۔''

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سعد سو گیا تھا۔ اس نے سعد کو بستر پر لٹایا اور اُٹھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ قمیص کو نیچے گرایا اور میری طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔

اس کی سانسیں، بدن کا نکتۂ پگھلاؤ، زلفوں کی خوشبو، میرے بدن کے ساتھ انجذاب کی انتہا تھی۔ میرے سینے کے ساتھ اُس کی پیٹھ تھی۔ میرے ہاتھ کیا تلاش کر رہے تھے۔ وہ خراشیں جو ننھے ناخنوں نے لگائی تھیں اور جن کے عین الیقین کو میں حق الیقین میں بدلنا چاہتا تھا۔ اس نے زور سے میرے ہاتھوں کا جھٹکا اور پھر اسی شام میں گھر سے نکل آیا۔

ماریہ مارغریطہ کی کھرپی اور برش کے نیچے سے نکلنے والے بچے اور ذنوبہ الخلیلی کے رحم سے نکلنے والا بچے کہاں جا کے ملتے تھے کہ میرا تخیل غوطہ کھا کے وہاں پہنچ گیا تھا۔ عورت دریافت کی وجہ ہے۔ عورت موجد بھی ہے۔ وہ کیسے اور کہاں سے تار سے تار ملاتی ہوئی زندگی کی بازیافت کرتی ہے۔ کیا مرد ایک چھوٹی سی مکھی بھی بنا کے اس کے اندر جان ڈال سکا ہے۔ کبھی تو وہ اپنے بدن کی طنابیں توڑ کر ایک زندہ انسان کی دریافت کرتی ہے اور کبھی ایسی دریافت میں اپنے اعصاب اور خلیوں کو بھی کھدیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اس لامختتم کہانی کو کوئی انجام میں اس لیے بھی نہیں دے پایا ہوں کہ اب میں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ عورت بہر حال کئی سمتوں سے مرد سے آگے ہے۔ ماریہ مارغریطہ کے ساتھ میری غیر مشروط محبت کی کہانی کو انجام اُسی شام کو مل گیا تھا۔ جس شام کو میں نے ـــــ خیر چھوڑیئے اس کا ذکر بعد میں سہی۔ یہ بھی میرے وجدان کا قصور تھا کہ جو سمجھتا رہا کہ میں ایک غیر نسوانی بدن رکھنے والی عورت کی افلاطونی محبت میں مبتلا ہوں اور میرا یہ خیال میرے مثانے اور فوطوں پر بوجھ

پڑنے سے پہلے کا تھا۔

اب جب کہ میں تجزیہ کرنے کے قابل ہوا ہوں تو یاد کر سکتا ہوں کہ محبت تو مثانے میں رُکے ہوئے پیشاب جیسی چیز ہے۔ معذرت کے ساتھ! کیا مجھے یہ غلیظ مثال دینی چاہیے؟؟ نہیں، مگر ایسا ہی ہے اور جب تک یہ پیشاب مثانے کے اندر رہتا ہے پورے بدن کو اینٹھن اور اکڑن میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کے اخراج کے بعد سارا بدن ایک گہری، پراسرار تسکین کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔

ذنوبہ الخلیلی سے میں بھاگ آیا تھا کہ سماج اور اخلاقیات کا یہی حکم تھا۔ ماریہ مارغریطہ نے مجھے کبھی اس قابل نہیں جانا تھا کہ اپنے بدن کے سیال آتش میں شریک کرتی۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ میں دو عورتوں کے درمیان کا ایک وقفہ ہوں اور اس شام بھی صحرا میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ شدید آندھی نے گذشتہ دن کے کھدے آثار کو مٹا دیا تھا۔ آہ ـــــ مجھے لگا کہ محبت بھی انہی ریت میں کھدے ہوئے آثار جیسی ہے۔ بدگمانی کا ایک بگولا بھی اٹھتا ہے تو پچھلی ساری دریافتوں پہ ریت بٹھاتا چلا جاتا ہے اور پھر دوبارہ، ہر روز، ہر لمحہ، ہر لحظہ کھودنی پڑتی ہے اور میں جو کہ دو عورتوں کا درمیانی وقفہ ہوں میں کسی ایسے ہی زمانی نکتے کے اندر ٹھہر جاتا ہوں۔ اس شام کو جب صحرا میں بگولے اٹھ رہے تھے اور میں تنہائی اور لایعنیت کے کسی لمحے کی گرفت میں تھا۔ جب وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی میرے پیچھے آئی جانے وہ کیا سوچ کر آئی تھی۔ وہ عورت جو پچھلے کئی سال سے مجھے مطلوب رہی تھی مگر میں جس کی طلب نہیں تھا۔ میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ اس کے استخوانی ہاتھ کو میں نے اپنے کندھے پر محسوس کر لیا تھا۔ مگر اپنے بدن میں کوئی برق رو محسوس نہ کر سکا۔ شاید وہ غلط وقت پر آئی تھی اور یہ وہ لمحہ تھا جب میرا ہاتھ میری رانوں کے درمیان تھا اور نیچے ریت پر سیال آتش ـــــ میں نے کہا نا! محبت کے متعلق میرا خیال مثانے اور فوطوں پر بوجھ پڑنے سے پہلے کا تھا اور اب جبکہ میں ایک زلزلے کی کیفیت سے گزرنے کے بعد پُرسکون ہوں تو ماریہ مارغریطہ آئی ہے۔

شاید وہ غلط وقت پر آئی ہے۔

اوڈ کالونی

شہر سے کوئی پندرہ کلومیٹر باہر نکل کر ایک رابطہ سڑک کے اوپر یہ کالونی واقع ہے۔ شہروں، چوکوں، چوراہوں کے نام زیادہ تر رکشے، یکے، بس اور لاری والے رکھتے ہیں۔ ضلعی وصوبائی حکومتیں نیز مرکزی حکومتیں بھلے ہی کسی جگہ یا سڑک کا نام کسی اہم شخصیت کے اعزاز میں اعلان کر دیں۔ مشہور وہ تب ہی ہوتا ہے جب رکشے، یکے یا پھر بس، ویگن والوں کی زبان پر چڑھ جائے۔ اس کالونی کا نام بھی ایسے ہی پڑا ہوگا۔ کیونکہ یہاں کے مکین اب ایسے بھی اوڈ نہیں رہے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں کے مالک ہیں اور اپنے کاروبار چلاتے ہیں۔ وہ دن کو کبھی کالونی میں نظر نہیں آتے۔ میں روزانہ اس رابطہ سڑک سے گذر کر صبح سویرے شہر جاتا ہوں۔ جہاں کی بڑی کچہری میں خرگوش کے بھٹ جتنی میری دکان ہے جس کے اوپر جلی حروف میں ''سانول اسٹامپ فروش'' لکھا ہوا ہے۔ دن کے گذرنے پر میں اُسی بس سے واپس گھر کو لوٹتا ہوں اور آتے جاتے میرا سامنا سڑک کے دونوں طرف قائم اس کالونی سے پڑتا ہے۔ یہ کالونی اب میری زندگی کا حصہ ہے۔ کوئی بھی بس یا سواری اس کالونی میں رک کر یہاں سے سواریوں کو اٹھائے اور اُتارے بغیر نہیں گذر سکتی۔ اگر کوئی بس، یکہ یا رکشہ ایسی بغاوت کرتا ہے تو اگلے دن اس کا روٹ بدل چکا ہوتا ہے۔

صبح صبح بڑے اشتیاق کے ساتھ مجھے تیار ہوتے دیکھ کر میری بیوی لازمی چونکتی ہے وہ سوچتی تو ہوگی کہ میرا یہ اشتیاق اپنی چوہے کے بل جتنی دکان کے لیے تو ہرگز نہیں ہو سکتا جہاں میں اپنی بیزاری کے کئی سال گذارتا آ رہا ہوں۔ ممکن ہے وہ ایسا سوچتی ہو۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے روزمرہ کے امور نپٹانے میں الجھی نظر آتی ہے۔ اسٹامپ فروخت کرنے سے آمدن کافی ہو جاتی ہے کم از کم میرے اُس محلے دار وکیل سے تو زیادہ ہی ہو جاتی ہے جو روزانہ میرے ساتھ اُسی بس پہ کچہری جاتا

ہے۔ ہماری ایک مثلث ہے۔ میں، وکیل صاحب اور ہمارے محلے کے امام مسجد کا نوعمر لڑکا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی اُس بس پہ شہر جاتا ہے اور اُسی وقت واپس لوٹتا ہے۔ ہم تینوں ایک ہی محلے کے ہیں۔ ایک ہی بس پہ، ایک ہی وقت میں شہر جاتے ہیں۔ مگر ہمارے مرتبے میں فرق ہے اور یہ فرق پیشے کا ہے جو کہ بس میں بھی نمایاں رہتا ہے۔ وکیل صاحب کے لیے ہمیشہ ایک نشست خالی رکھی جاتی ہے۔ مجھے بھی اکثر بیٹھنے کو مل جاتی ہے۔ مگر امام مسجد کا لڑکا زیادہ تر نشستوں کے درمیان بنی راہداری میں چھت کا ڈنڈا پکڑے کھڑا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شہر میں بھنے ہوئے چنے بیچنے جاتا ہے۔

یہ چند ہفتے پہلے کی بات ہے جب ایک شام واپسی پر بس کنڈکٹر اور چنے فروش لڑکے کے بیچ جھگڑا ہو گیا جب جھگڑا کچھ زیادہ بڑھا تو وکیل صاحب نے بیچ بچاؤ کی ٹھانی اور پرائے پھڈے میں کود پڑے۔ لڑکے نے وکیل صاحب کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ بس میں عدالت لگ گئی۔ اپنی مختصر سی جسامت کی طرح اپنی عزت کو سنبھالے میں اپنی نشست میں دُبکا رہا۔ میں جانتا ہوں مجھے کس وقت پر کیا کرنا ہے۔ میری جیب میں کچن کے خرچے کے پیسے ہوتے ہیں اور وکیل صاحب واپسی پہ چائے بھی ادھار پی کے آتے ہیں مگر چنے فروش کی جیب میں واپسی پر دو ہزار، پچیس سو روپیہ ضرور ہوتا ہے۔ عدالت جو بس میں شروع ہوئی تھی بس میں ہی ختم ہو گئی۔ وکیل صاحب نے ازراہ مذاق اپنی فیس مانگی، لڑکے نے بلا تامل دو ہزار روپیہ نکال کے اُن کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ وکیل صاحب نے بس سے اُترتے لمحے وہ پیسے لڑکے کو واپس کر دیے۔ مگر اُس شام کے بعد سے وکیل صاحب کی بھاری بھر کم بچھو دم مونچھیں جو کلف لگے کپڑے کی طرح تنی رہتی تھیں۔ اب چنے فروش کو دیکھ کر کچھ جھک سی جاتی ہیں۔ جھک تو میں بھی اندر سے جاتا ہوں۔ اپنی عمر سے نصف عمر کے اُس لڑکے کی آمدن کا خیال کر کے میری بیماری کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

پچھلے اتوار کو کپڑے دھوتے وقت میری بیوی نے میری شلوار پر پھر خون کے دھبے دیکھے ہیں۔ اب پھر گھر میں پھیکا سالن پکنے لگا ہے۔ وہ نمک اور ہلدی ڈال کے سالن بگھار دیتی ہے۔ خود وہ دال کے ساتھ اچار رکھ کے گزارا کر لیتی ہے۔ غریب عورت میری بیماری کا تاوان بھگت رہی ہے۔ کہنے کو تو میں کئی سالوں سے اس سڑک سے اوڈ کالونی کے بیچوں بیچ سے گزر رہا ہوں۔ جانے یہ رنگ برنگی کالونی یہاں کب سے قائم ہے۔ مگر میرے لیے اس کی پیدائش تب ہی ہوئی ہے جب یہ میرے دھیان میں آئی ہے اور دھیان میں تب آئی جب چقندر جیسی رنگین مگر بدذائقہ بیچاری نے میری زندگی کو پان کی پیک بنا دیا تھا۔ تب میں اکثر بس میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھ کر باہر کے رنگین مناظر کو دیکھنے

لگا تھا۔ خاک اور سبزے کے درمیان باقی رنگ ہمیشہ ہی مجھے پھیکے سیٹھے لگتے ہیں مگر اوڈ کالونی رنگوں کی کالونی ہے۔ اس کالونی کے رنگ برنگے مکانوں کی طرح یہاں کی مکین عورتوں کے نام بھی بڑے رنگین ہیں مثلاً نیلی، پیلی، لالی، فیروزہ، کاسنی وغیرہ۔ وہ روزانہ آٹھ دس کے حساب سے بس میں سوار ہوتی ہیں اور ایک دوسری کو انہی ناموں سے مخاطب کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض کے کولہوں پہ چھوٹے بچے ٹنگے ہوتے ہیں اور بعض جو زیادہ جوان ہیں وہ فارغ ہوتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ روزانہ شہر کیا کرنے جاتی ہیں۔ مگر جب واپس آتی ہیں تو سب کے ہاتھوں میں سامان کے بڑے بڑے تھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ رنگین ہے۔ اُس کا نام ''گلابی'' ہے۔

یہ بیتے دنوں کے خوشگوار موسم کی شام تھی۔ میں اپنا سر اگلی سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹکا کے سو گیا تھا جب ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی۔ میرے کندھے پر کسی نرم سی چیز کا بوجھ تھا۔ پہلی چیز جس پر میری نظر پڑی وہ ایک ہاتھ تھا جو بالکل میری نظر کی سیدھ میں اگلی نشست کی پشت کو بالکل اُسی جگہ سے تھامے ہوئے تھا جہاں کچھ لحظے قبل میرا ماتھا ٹکا تھا۔ ایک بدرنگ اور بھدا زنانہ ہاتھ، جس کے کٹے پھٹے اور بے ترتیب ناخنوں پہ کوئی مٹیالے رنگ کی پالش بھی نہایت بھونڈے انداز میں لگائی گئی تھی۔ ہاتھ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے چہرہ اوپر اٹھایا تو دنگ رہ گیا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اتنے بھدے اور بدرنگ ہاتھ کے ساتھ اتنا رگڑا منجھا ہوا رنگین چہرہ کم از کم میرے مشاہدے میں پہلی بار آیا تھا۔ رگڑ رگڑ کے چمکائی گئی جلد کے رخسار گلابی رنگ کی پھوٹ دے رہے تھے۔ لبوں پہ گلال بکھرا تھا، سیاہ حاشیوں میں سجی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے پپوٹوں پہ دھنک اُتر آئی تھی اور دوہری پُر گوشت ٹھوڑی کے فوراً نیچے ہاتھوں ہی کی طرح بھدی گردن تھی۔ میرے اس طرح غور سے دیکھتے رہنے کا اُس نے بُرا نہیں منایا۔ بلکہ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو ایک عجیب پُر فریب سا غرور اُس کے چہرے پر چھا گیا جیسے یوں مسلسل محویت سے دیکھے جانا اُس کا حق ہے۔ کچھ آگے جا کے بس رُکی اور وہ لوگوں کو دھکیلتی نیچے اُتر گئی۔ یہ ''گلابی'' سے میرا پہلا تعارف تھا۔

اس کالونی کی سبھی عورتوں کے چہرے رنگین ہیں۔ آٹھ سال کی بچی سے لے کر پچاس سال کی عورت تک کا چہرہ غازے، سرخی اور لالی سے سجا رہتا ہے۔ وہ اسی دلآویز رنگین چہرے کے ساتھ کپڑے دھوتی، جھاڑو لگاتی، کریانہ سٹور چلاتی، نالیاں صاف کرتی اور گھروں سے باہر کھڑی ہو کر ایک دوسری سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ اسی رنگین چہرے کے ساتھ شہر جاتی ہیں اور وہاں سے سودے سلف کے تھیلے بھر کے ساتھ لاتی ہیں۔ ''گلابی'' روزانہ شہر جاتی ہے۔ اکثر جب میں بس میں

دائیں طرف بیٹھتا ہوں تو وکیل صاحب بائیں والی رو میں ہوتے ہیں۔ بس جب اوڈ کالونی رکتی ہے تو باقی ہم جولیوں کے ساتھ گلابی بھی سوار ہوتی ہے۔ سیٹ نہ ہونے کے سبب وہ ساری درمیان والا ڈنڈا پکڑ کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تب میری باہنی اور وکیل صاحب کی داہنی آنکھ گلابی کے بدن پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ وکیل صاحب گلابی کو گھورتے وقت مسلسل اپنی بچھو دُم مونچھوں کو تاؤ دیتے رہتے ہیں اور مجھے اُن کی آنکھ پہ تاؤ آتے رہتے ہیں جو کُتا مکھی کی طرح گلابی کے بدن پر بھنبھناتی رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے مونچھوں کو بل دیتے وقت وہ بھی میری باہنی آنکھ کے بارے میں یہی سوچتے ہوں۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو ٹھیک ہی سوچتے ہیں۔ یہ کام ازل سے ایک دوسرے کے ذمہ ہی چلا آ رہا ہے۔ اب میں اپنی آنکھ کو گناہ گار سمجھتے ہوئے اس پہ مکا تو نہیں جما سکتا اور نہ وکیل صاحب ایسا کر سکتے ہیں۔

لہٰذا ہم نے ایک دوسرے کا کام سنبھالا ہوا ہے۔ گلابی ہم دونوں کی اس نفسیاتی جنگ سے بے نیاز نظر آتی ہے۔ ایک نامعلوم سی رقابت وکیل صاحب کے اور میرے بیچ پروان چڑھ رہی ہے جس میں ایک دلآویزی بھی ہے کیونکہ اس میں زندگی کی کاہش ہے۔ جب آپ کا کوئی رقیب یا دشمن پیدا ہو جائے تو سمجھیے کہ اب آپ زندگی کے میدان میں جان کا جوکھم لے کر اتر آئے ہیں۔ جب سے میں نے وکیل صاحب کے رقیبانہ تیور محسوس کیے ہیں میں زندگی کو محسوس کرنے لگا ہوں۔ گلابی بظاہر بے نیاز بنی کھڑی رہتی ہے۔ اُس کے گلابی گال کچھ اور بھی تمتمانے لگتے ہیں جب وہ بس میں سوار ہو کر ہم دونوں کے بیچ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اُس کی پھنسی ہوئی قمیض کے اندر سے اُس کا بدن اپنے نقش و نگار کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ بڑے بڑے اُبھاروں کے نیچے اُس کا پیٹ ہموار ہے مگر ناف کے نیچے پیٹ کا کچھ حصہ بڑھا ہوا ہے۔ پھر بھی بُرا نہیں لگتا۔ گلابی متناسب الاعضاء عورت ہے۔ اپنی تنگ قمیض کے نیچے وہ جرسی نما کپڑے کا پاجامہ پہنتی ہے جس سے اُس کی ٹانگوں کی ساخت بالکل واضح دکھائی دیتی ہے۔ وہ مختلف نفسیات کے مردوں کی الگ الگ پسندیدگیوں کے لیے نہایت مناسب عورت ہے۔ اس بات کی وضاحت میں یوں کر سکتا ہوں کہ اگر کسی مرد کو عورت کے اُبھاروں سے رغبت ہے تو گلابی مایوس نہیں کرے گی۔ اگر کوئی رانوں اور کولہوں سے اُبھرتا ہے تو گلابی اس حوالے سے بھی بھرپور ہے۔ اگر کسی کا مسئلہ پنڈلیاں ہیں تو بھی گلابی مکمل ہے۔ کلائیاں، ہاتھ، پاؤں وہ سبھی حوالوں سے کاملیت کی علامت ہے۔ بھدا پن اور تناسب مل کر اس کے پورے بدن کے اندر ایک ایسی ہم آہنگی اور توازن بنا چکے ہیں کہ جسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ میں اُس کے جسم کی وضاحت کرنے کے معاملے میں اتنا بے باک کیوں ہوں؟ کیا میں اپنی بیوی کی شرح البدن اتنی آسانی سے کر سکتا ہوں؟

ناممکن ہے۔

وہ ایک سپاٹ عورت ہے۔ ایک ہی مرد تک محدود رہنے والی گھریلو عورتوں کی طرح بے رنگ اور پھیکی۔ میری چقندر جیسی سُرخ مگر بدمزہ بیماری پر منہ بنا کر میرا استقبال کرتی ہے کیونکہ اُسے میری خاطر پھیکے کھانے کھانے پڑتے ہیں۔ یہ پھیکا پن اُس کے اندر ہے یا میرے اندر؟؟

میری وجہ سے اُس کے اندر آیا ہے یا اُس کی وجہ سے میرے اندر؟ وہ نمک اور ہلدی والے سالن کھا کھا کر جی اوب جانے کی شکایت کرتی ہے۔ جبکہ میں جانتا ہوں میرے گھر سے نکلنے کے بعد وہ اپنے ذائقے کے لوازمات پورے کر لیتی ہوگی۔ میں بھی تو یہی کر رہا ہوں۔ گلابی نے میری زندگی کے کورے کاغذ میں سرخ رنگ بھر دیے ہیں۔ میں ان رنگوں کو دیکھتا ہوں تو پرکھتا ہوں اور پھر میرا دھیان اُس عورت کی طرف جاتا ہے جو بے رنگ اور پھیکی ہے۔ گلابی کے بدن کا ہر خم مجھے رشتوں کا ایک نیا زاویہ دے جاتا ہے۔ چاہے وہ وکیل صاحب کے ساتھ رقابت کا رشتہ ہو یا بیوی کے ساتھ بدمزگی کا، گلابی ان سبھی کیفیات کی خالق ہے۔

گلابی کے بدن کی وضاحت میں اس لیے بھی کر سکتا ہوں کہ میری نفسیات ذرا ٹیڑھی ہے۔ میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوں اور اپنے ہاتھ کے ہنر سے واقف بھی۔ ایک عملی مرد سے زیادہ تخیلاتی سطح پر کام لینے والا مرد جنسی نفسیات کا زیادہ گہرا پارکھ ہو سکتا ہے۔ یہی فرق مجھ میں اور وکیل صاحب میں ہے۔ وکیل کی آنکھ گلابی کے ابھاروں سے لے کر کولہوں تک دوڑتی ہوئی کسی اندھی طاقت اور طمانیت کی غمازی کرتی ہے مگر اس کی جیب اکثر خالی رہتی ہے۔ چنے بیچنے والا لڑکا بھی اب اس کھیل کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کی کمائی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے جبکہ ان دونوں کے برعکس مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس رہتا ہے۔ میری جیب میں صرف کچن چلانے کے پیسے ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں گلابی جیسی زبردست عورت کو شانت کرنے کے لیے نہیں بنا ہوں مگر پھر بھی روز اس کھیل تماشے میں چوتھے کونے کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ وکیل صاحب، گلابی، چنے بیچنے والا اور میں، اپنی اپنی نفسیات کی بساط کے مہرے ہیں۔ جو اپنی اپنی چالیں چل رہے ہیں۔ بس چلتی جا رہی ہے۔ سڑک پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے۔

اوڈ کالونی کا رنگین بہاؤ جاری ہے۔

اور میری بیوی ــــــ

کیا کبھی کسی نے اُس کے بارے میں بھی سوچا ہے؟؟؟

آئینہ گر

ہستی اور نیستی کے سارے اسرار چھوٹے چھوٹے لمحوں کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں لمحے جو کہ آتے رہتے ہیں مگر کم کم آتے ہیں کہ جن کے بطن سے حقیقی خوشیوں اور لذتوں کے سرچشموں کو جنم لینا ہوتا ہے۔

چاول پلیٹ میں ڈال دو؛ سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر انہوں نے کہا، وہ آگے بڑھ کر ان کے قریب کھڑی ہوگئی۔ پلیٹ میں چاول ڈالتے وقت ہاتھ کپکپا گئے اور تھوڑے چاول باہر گر گئے۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا، مگر وہ منہ دھیان تھے۔ وہ جلدی سے کچن سے تولیا اٹھا کر لائی اور میز کو صاف کر دیا۔ وہ اب پلیٹ کو سرکا کر اپنے سامنے کر چکے تھے، مگر نظریں بدستور ٹی وی کی سکرین پر جمی تھیں۔ وہ ان کے سامنے آ کر بیٹھ گئی اور ان آنکھوں کے اندر جھانکنے لگی جو ٹی وی کی سکرین پر جمی تھیں اور کہیں دور اس کی روح کے اندر گڑی تھیں ــــــ

اس نے ایک آنکھ درز کے اوپر رکھ کر دوسری طرف جھانکا تو بصارت کو سخت دھچکا لگا۔ دوسری طرف تو کچھ بھی نہ تھا۔ بصارت واپس لوٹی تو زخمی تھی، اس کی نظر آئینے کی طرف چلی گئی، آئینہ ٹکڑے ٹکڑے تھا کچھ بھی سلامت نہ تھا۔ نہ اس کے اندر نہ باہر، اس کا بدن لہولہو تھا، کانچ کے سارے ٹکڑے اس کے وجود کی ایک ایک پور میں چبھ گئے تھے۔ کراہ کر اس نے کمر پر ہاتھ رکھا اور ہونٹ سہلائے، کمر اور ہونٹ کنکروں سے پر تھے، زخمی تھے، لہولہو تھے، اس نے فریاد کی۔ میری کمر اور ہونٹوں کو تو بخش دیا ہوتا کہ ان پر تو جنت کی مہروں کے نشان ثبت تھے۔ زمان کے لکھوکھا سال کے چکر میں وہ چند لمحے ہی تو اس کے اپنے تھے جن کو وہ اپنا کہہ سکتی تھی۔ پکے ہوئے رسیلے پھل کے جیسا، نظر زبان اور ہاتھوں کو اختیار سے باہر کر دینے والا بدن جانے وہ کب سے سنبھالے ہوئے تھی۔ جن ہاتھوں کو یہ

پھل توڑنا تھا وہ کبھی اس کی جانب نہ بڑھے۔ ہزاروں ندیدی نظریں، للچائی ہوئی زبانیں اور نامراد گستاخ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے رہے، مگر جونہی کوئی اس کی طرف سیڑھی لگاتا وہ کہیں اوپر چلی جاتی۔ وہ سارے طلب گاروں کے لیے نظر کے دھوکے کی طرح تھی ،نظر آتی مگر جب وہ قریب پہنچتے تو غائب ہوجاتی۔ جن آنکھوں کو وہ پھل دیکھنا تھا وہ کبھی اس کی جانب نہ اٹھیں جب آنکھیں ہی نہ اٹھیں تو ہاتھ کیسے پہنچ سکتے ہیں اور پھر زبان تک جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا___

اس کی کمر پر گداز ہتھیلی کا ہلکا سا لمس جاگا ہونٹوں پر ہونٹوں کی خوشبو نے سسکاری لی۔ ہلکے سے دباؤ کا لمس اور نرم ہونٹوں کی خوشبو کا لمس،خوشبو اس کے حواس پر چھا گئی اور یوں لگا ہر طرف پھول کھل گئے ہوں اتنا لطیف،اتنا نرم اور اتنا پر اثر؟؟؟

ہاں___ خوشبو آزاد ہوئی___

وہ بہت کم تھا

اختصار اس کا جمال ہے۔

اختصار___ صدیاں مختصر لمحوں کی گرفت میں آگئیں وقت کٹتا رہا، جگر کٹتا رہا، بدن کٹتا رہا، اس کا سارا بدن لہولہو تھا۔

میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا پھر کیوں سنگسار کردی گئی؟ یہ بدن تو میرا تھا پھر خلقت کو کس نے حق دیا تھا کہ اس پر اپنے پتھر پھینکے؟ یہ سماعت تو میری تھی پھر لوگوں کو کس نے اجازت دی تھی کہ میری سماعت کو گالیوں کی شنوائی دیں۔ میں نے تو کسی کو بھی تکلیف نہیں دی تھی پھر مجھے کیوں اذیت دی گئی؟ شکستہ آئینے کی ایک ایک کرچی میں اس کے بدن کی الگ الگ بوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ جسم تکمیل سے قبل ہی منتشر ہوکر ختم ہوگیا تھا۔

اس نے کتاب کا پہلا صفحہ کھول کر ایک نام پر انگلی رکھی۔ یہ دیکھو! وہ اس کے کندھوں کے قریب جھک آئی سرورق___ جایا کپور

ہوں___ اس نے اشتیاق کے ساتھ کہا۔

وہ تو کافی مشہور ہے___

ہاں اس کتاب کا ٹائٹل اس نے بڑے شوق کے ساتھ بنایا ہے!

وہ اشتیاق کے ساتھ کتاب کے ٹائٹل کو دیکھنے لگی___.

تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں جانتی ہو.؟ وہ قریب سے بولا___

جانتی ہوں اس نے ناگواری سے کہا اور ناک سکیڑی___

کیا ہوا ہے؟

پیچھے ہٹو الکوحل کی بو آرہی ہے مجھے___

اچھا ہٹ جاتا ہوں وہ پیچھے ہٹ گیا۔مگر ان آنکھوں کو یہیں چھوڑ دو

جانتی ہو تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں

اچھی طرح جانتی ہوں تم مرد لوگ عورت کو ٹکڑوں میں ___ اور دھماکہ ہوا آئینہ ٹکڑے ٹکڑے تھا اور ہر ٹکڑے کے اندر وہ تھی نامکمل، بٹی ہوئی، لخت لخت، پارہ پارہ، کہیں آنکھیں تھیں، کہیں ہونٹ، کہیں سینہ تھا اور کہیں پیٹ۔ایک ٹکڑے کے اندر اس کی آواز تھی، ایک کے اندر لہجہ، ایک کرچی کے اندر اس کی قامت سمائی تھی، قامت، ہاں قامت اس کی سماعت نے سنا___

تعریف کیا ہو قامت دلدار کی شکیب
مجسم کردیا ہے کسی نے الاپ کو

کوئی اس کے کان کے قریب بولا تھا۔مصنوعی رومانوی لہجہ تو اس کو متاثر نہ کرسکا مگر شعر کے الفاظ پر وہ چونکی اور لہرا گئی۔ اس کی نظر دوسرے ٹکڑے پر پڑی جہاں اس کی آواز قید تھی دیپک!!!دیپک!!دیپک!!

تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں دیپک؟

بات کرتی تو ہوں___

نہیں تم مجھے اگنور کرتی ہو___ آخر ایسا کیا ہے؟

ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے میں بس ایسی ہی ہوں

میں صرف تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں

کیا ہے میری آواز میں؟

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ریکارڈ کرلو میری آواز سنتے رہا کرو

میں تمہاری آواز کا عاشق ہوں،

آواز کا عشق بھی کوئی ہوتا ہے تم مرد لوگ ناں ٹکڑوں میں___ کرچیاں چیخنے لگیں

چلانے لگیں تھیں ۔آوازیں گڈمڈ ہوگئیں ۔لہواور بوٹیاں رقص کرنے لگے۔اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ ٹکڑے بغاوت پرآمادہ تھے۔اودھم مچارہے تھے۔آواز کی قید والاٹکڑا چلایا دیپک، دیپک سفید ریشم سا سرسراپا سفید رنگ، سفید جلد، سفید کھال، سفید مخروطی انگلیوں کے اندر جڑے گلابی نگینوں جیسے ناخن، سفید کھال اورموٹے ہونٹ، اس کے بدن کے منتشرٹکڑوں میں کراہت نے انگڑائی لی۔نفرت سے اس کے معدے میں ابال اٹھااوراس کوابکائی آنے لگی____

تم نہیں جانتی ہوسفید رنگ سوعیب چھپالیتا ہے____

کیا؟؟؟؟ کہیں اس کا دل پھڑکااورآنکھوں کے کٹورے چھلک پڑے

ہاں محض سفید رنگت بھی بعض اوقات سیاہ نصیبوں کے مقدرتج دیتی ہے۔ دماغ، عقل، وجداں، کردار، نقش، نگار، سلیقہ، ان میں کیا رکھا ہے سفید رنگت تونظروں کے اوسان خطا کردیتی ہے بدن کے جزداں لپیٹ دیتی ہے فاعل کومفعول، ضارب کومضروب بنادیتی ہے____

بس کردو مجھے ابکائی آرہی ہے____

تمہیں نفرت سے ابکائی آرہی ہے؟؟؟

نہیں رشک اورحسد سے بھی ابکائی آسکتی ہے

چٹاخ کی آواز آئی اس نے پلٹ کر دیکھا آواز کی قید والی کرچی پر کسی نے پتھر مارا تھا۔ پتھرکہاں سے آیا تھا۔اس نے سمت کا تعین کیا تواندازہ درست نکلا۔وہ جبراورضبط کی آخری سرحد پر کھڑا تھا، مگروہ پاس سے گزرگئی____

تم نے پوچھا تک نہیں مجھ پر کیا گزری یوں غیروں کی طرح لاپرواہی سے گزرگئی۔ میں اپنی زندگی کی جبراورضبط کی آخری حدبندیوں سے گزررہا ہوں آواز پانی بن کراس کی سماعتوں کے اندر بہہ نکلی____ خودغرضی ہے اس کوآخرایک نہ ایک دن توکسی اورکا ہونا تھا____

مگراس نے یوں کیوں کیا؟؟

کیا کیا اس نے؟

وہ کچھ عرصے سے بہت محتاط ہوگئی تھی مجھ سے کترانے لگی تھی____

تواس کواس کے گھر میں بسنے دواگراتنی ہی محبت تھی تواس کواپنا لیا ہوتا گراپنانے کا حوصلہ نہ تھا تواس کا گھرتومت اجاڑو۔

دیپک میرے ساتھ ہمدردی کروتم میری دوست ہو____

مگرمیں ایک عورت بھی ہوں

تم بدلحاظ ہوگئی ہو

ہاں میں ہوں بدلحاظ تمہارااس کے ساتھ جسم کا رشتہ تھا؟

نہیں

تھا!!!!!!

نہیں تھا____

میں جو کہہ رہی ہوں تھا!!!اجس ٹوٹ پھوٹ کے شکارتم ہو، مرد ہویا عورت محبت کے تعلق میں سب سے زیادہ توڑ پھوڑ جسم کا رشتہ ہوتو ہوتی ہے۔ یہ جوتم سہہ نہیں پارہے تم اس شخص کے تصور میں ہلکان ہورہے ہوجس کے پہلو میں وہ لیٹی ہوگی، یہ سب چلا چلا کراعلان کررہے ہیں کہ تمہارااس کے ساتھ جسم کا رشتہ تھا____ ہاں____ تھا____ اس نے ٹھہرٹھہر کرادا کیا اورگردن جھکادی____

دھم کی آواز کے ساتھ کوئی گرااس نے آنکھیں کھول دیں۔کانچ کے بے شمارٹکڑے اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے جن میں اس کا سراپا پریشان تھا۔اس نے کانچ کے ایک ٹکڑے کواٹھایا گاڑی کے سامنے والے بیک ویومرر کوایک خاص زاویے پرسیدھا کرتے ہوئے اس نے ساتھ والی ساتھی کو پکارا۔ذرااس کے چہرے سے چادرتوہٹادو۔

اس نے ہاتھ بڑھائے اوراس کی ناک کے اوپر سے چادر نیچے گرادی۔اس نے ایک دم سامنے دیکھا۔وہ شیشے کے اندر سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

تم مجھے ''مریم''، جیسی لگتی ہو

کون سی مریم؟

اس نے موبائل کے اندرگیلری میں سے ایک تصویرنکالی اوراس کے سامنے کردی____

اوہ____

ایک طویل قہقہہ اس کے لبوں سے چھوٹا

یہ مریم نہیں ''مونا لیزا'' ہے لیونارڈو وانچی کی بنائی شاہکارتصویر جوکہ اس نے لکڑی پر بنائی تھی وہ دیرتک ہنستی رہی____

وہ شرمندہ ہوگیا۔میں اس کومریم بنت عمران سمجھتا رہا

مگر یہ مجھ جیسی کب ہے اس کی توبھنویں بھی نہیں؟؟؟؟؟

بھنویں لگادو تو تمہارے جیسی ہی لگے گی ۔ویسے اس کی بھنویں کیوں نہیں ہیں تمہیں تو ہر بات کا پتا ہوتا ہے بتاؤ گی؟

ہاں جس دور میں لیونارڈو انچی نے یہ شاہکار تخلیق کیا اس دور میں حسینائیں اوراونچے طبقے کی عورتیں بھنویں مونڈا کرتی تھیں یہ اس دور کے فیشن کا حصہ تھا

مجھے لگتا ہے میں تمہارا بچہ ہوں ـــــ گرم سانسوں کی آری اس کی گردن کاٹنے لگی۔ تمہی سے جنموں تو شاید مجھے پناہ ملے۔، سانس کو سانس نے قطع کیا۔ مجھے اپنے اندر دفن کرلو۔

وہ گرم لاوے کی زد پہ تھی کہ شانت ہوگئی۔نہیں یہ بدن یہ ہونٹ امانت ہیں کسی کی، اس کی روح کے اندر آنکھیں لرزیں۔ ٹی وی سکرین پر جمی لاپرواہ آنکھیں اس کی روح کے اندر اس کے بدن کی نگرانی کررہی تھیں۔ وہ کتنے ٹکڑے یکجا کرتی جن کو اس نے بچا بچا کر رکھا تھا، جن کو وہ چھپا چھپا کر لائی تھی ، کتنے پتھر اس کے بدن پر پڑے تھے، ہر پتھر پر اس کے کسی نہ کسی محروم کا نام کندہ تھا۔اس کا بدن لخت لخت تھا،لہولہو تھا، وہ ایک ایک بوٹی کو سنبھالتی پھری، شکستہ آئینے کے ایک ایک ٹکڑے کو یکجا کرتی گئی، اس آئینہ گر کے انتظار میں جو ان ٹکڑوں کو جوڑ کر اس کی تجسیم کرسکتا تھا، جو اس کی بوٹیوں کو ملا کر اس کی تکمیل کرسکتا تھا، آنکھیں ہونٹ، قامت، آواز، سراپا سبھی پر محرومیوں کے پتھر پڑتے رہے مگر آئینہ گر تھا کہ اس کی آنکھیں ٹی وی کی سکرین پر چپکی تھی، وہی آنکھیں جو اس نے اس کی روح کے اندر گاڑ دی تھیں۔

ہستی اور نیستی کے سارے اسرار انہیں ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے۔ آئینہ گر کو کون سمجھاتا کہاں پر کتنا غدر مچا تھا۔ وہ جس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا وہ سنگسار کیوں کی گئی تھی۔ اس نے کیا کیا تھا؟ وہ تو ٹکڑوں کی سالمیت کی ہوس میں ہلکان ہوتی رہی۔اس کی روح کے اندر آنکھیں گڑی تھیں۔ آنکھیں جو اس کی نگران تھیں ، وہ سر سے پاؤں تک، جسم سے روح تک شعور سے لاشعور تک کسی کی امانت تھی مگر امانت دار کبھی نہ لوٹا۔

ٹینشن تم پر سوٹ نہیں کرتی سمجھی!!

وہ چپ رہی

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
محبت سے بڑا دکھ تو کوئی بھی نہیں

آئینے کے سارے ٹکڑے سارے منظر غلط ملط ہوگئے۔

غلام بنت غلام

پٹھانو کے گھنے گھونگھریالے بالوں میں مٹی ،میل اور پسینے نے مل کر مزید گنجلگ پیدا کردی تھی۔ جونہی اس کے بالوں پر میری نگاہ پڑتی تو مجھے فوراً اس کے سر پر بنے گھونسلے کے اندر چڑیا اور اس کے انڈوں کی موجودگی کی جستجو لگ جاتی، مگر پٹھانو پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سر اور اس میں موجود جوؤں کے لشکروں تک سے بے نیاز تھی۔ جولائی کے شدید حبس میں جب مکانوں کے سائے ڈھل جاتے وہ دودھ، آٹا، چینی اور کبھی کبھی برف مانگنے کیلئے حویلی میں داخل ہوتی اور فرش پر پاؤں کے بل بیٹھ جاتی۔ میں نے بارہا اس کو اس طرح بیٹھنے سے منع بھی کیا تھا، اس لیے نہیں کہ مجھے اس پر ترس آتا تھا کہ وہ تھک جائے گی، میں اسے اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھنے کو کہتی حالانکہ مجھ میں اسے ساتھ بٹھانے کا حوصلہ نہ تھا، نہ ہی مجھے یہ خدشہ رہتا کہ اس طرح بیٹھنے سے کہیں وہ قطع نسل جیسی کسی خرابی کا شکار نہ ہوجائے کیونکہ دس بچوں کی ماں کے بارے میں ایسا سوچنا گناہ کے زمرے میں جاتا ہے، اس کی وجہ محض یہ تھی کہ پاؤں کے بل بیٹھنے کے بعد اس کی شلوار کے نیفے میں سے رنگ برنگے کپڑے اڑسے نظر آتے تھے اور مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ حویلی کے اندر جواں لڑکوں کی آمدورفت رہتی ہے میرے بیٹوں بھتیجوں میں سے کوئی یہ نہ پوچھ لے کہ پٹھانو نے نیفے کے اندر اس طرح کپڑا کیوں اڑس رکھا ہے۔مگر پٹھانو نے کبھی میری بات پر دکان نہ دھرا وہ واقعی بے نیاز تھی!!

دائیں کولہے کی ہڈی میں درد نے مجھے ذہنی بے کاری میں ڈال دیا تھا۔ ذہن زیادہ مشقت کرنے لگا تھا یا شل ہوگیا تھا میں قطعاً کچھ نہیں کہہ سکتی البتہ اپنے پردادا کے زمانے کی بنی حویلی کے اونچے چوباروں، کنگروں اور محرابوں کی بوسیدگی کے اندر رکے ہوئے زمانوں کو سوچتے

پہر گزر جاتے۔ کروٹ بدلنے پر آہیں نکلا کرتی تھیں۔ جسم پھیل گیا تھا۔ مجھ میں یوں بھی اب رہا ہی کیا تھا، میں کہ جس میں کبھی بہت کچھ تھا۔ اس چوکور حویلی کے صحن میں کھاٹ پر پڑی پٹھانو کا انتظار کرتی تھی۔ پٹھانو کی طرف میرا دھیان لگنے لگا تھا۔ میرا یہ لگاؤ ایک طرح کی مجبوری بھی تھی وہ مجھے دنیا جہاں کی خبریں سنایا کرتی تھی اور اس کی غلط سلط سنی سنائی باتیں سنتے سنتے وقت کا احساس ہی نہ رہتا۔ پٹھانو اور میرے حسب نسب اور خدوخال میں کتنا بعد تھا اور میری اور اس کی روح میں کتنی قربت ـــــ میں یہ سوچ کر حیران ہوتی۔ بہت دفعہ میں سوچتی کہ پٹھانو انسانی آزادی اور عظمت کے حوالے سے مجھ سے کہیں بہتر تھی۔ پرانی حویلی کے جنگلے کے اوپر بنے چھجے پر بیٹھی کبوتری کو دیکھ کر مجھے اپنا اور پٹھانو کا تعلق یاد آ گیا۔ میں اس پرانی حویلی کی طرح تھی اور پٹھانو کبوتری تھی۔ مسکراہٹ نے میرے لبوں کو وا کر دیا مگر اندر کہیں بے بسی، دکھ اور غلامی کے احساس کا زہر بھر گیا کبوتری پھڑ پھڑا کر اڑ گئی حویلی جہاں تھی وہیں رہ گئی

پٹھانو غلام بنت غلام تھی!!!

میں آزاد بنت آزاد تھی!!!!!

اصل غلام کون تھا؟ اصل آزاد کون ـــــ؟

وقت کے جبر نے کس پروپیگنڈے کے اندر رکھ کر ہمارے تانے بانے بنے تھے۔ آزادی کے نام پر ہمیں، ہماری نسلوں ہمارے اندر پنپتے نئی نسلوں کے جرثوموں کو پرانی حویلی کی طرح زمین کے ساتھ جکڑ دیا تھا۔ غلام کر دیا تھا۔ اور جو نام نہاد غلام کہلائے وہ کس قدر آزاد تھے۔ کس قدر آزاد تھے ـــــ وہ کبوتروں، چیلوں، کوؤں، کی طرح آزاد تھے۔ پورا آسمان پرواز کے لیے ان کے سامنے تھا۔ کھلا آسمان ـــــ

اور جو نباتات و جمادات کے مالک تھے، ان کا مقدر بھی جمادات کی طرح تھا۔ زمین کے ساتھ چپکے ہوئے بے بس لوگ۔ احساس برتری کی کمتری جن کی رگوں میں ڈال کر تاریخ نے جن سے بدترین انتقام لیا تھا۔ اور وہ جو غلام تھے پرندوں کی طرح آزاد تھے ـــــ سوچ سوچ کر بے کاری نے مجھے ذہنی مشقت میں ڈال دیا تھا۔ حویلی والے مجھ سے نالاں رہا کرتے تھے۔ کیونکہ میں دیر تک پٹھانو کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔ اور اس پہ رشک کرتی نہ تھکتی۔ اپنی بلندی اور عظمت کے نشے میں مخمور حویلی والوں کو یہ سب ناگوار گذرتا تھا۔ ان کی رگوں میں لہو کی جگہ احساس تفاخر دوڑتا تھا۔ وہ پٹھانو جیسے لوگوں کو زمین پہ چلتے مکوڑے سمجھتے۔ مگر میرا خیال الٹ تھا۔ پٹھانو مجھ سے کئی برس چھوٹی تھی مگر

ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی، سارا دن چلتی نہ تھکتی۔ اور میرا بھاری بھرکم بدن دن بھر کھاٹ پہ پڑا اکڑ جاتا۔ وہ مجھے زمین کے ساتھ چپکا گھسٹ گھسٹ کے چلتا کوئی مکوڑہ نہیں بلکہ کبوتری جیسی لگتی تھی۔ آزاد اور بے تکان، جبکہ اپنا وجود زمین کے ساتھ جکڑا ہوا لگنے لگتا تھا۔ جس کی اپنی کوئی مرضی تھی نہ ارادہ تھا۔

یہ اوائل جوانی کی بات ہے جب میری پٹھانو سے باقاعدہ دوستی ہوئی۔ اور اس دوستی کا سبب وہ واقعہ بنا جو اس دھرتی کا دیکھا بھالا مگر تب میرے لیے نیا تھا۔ یہ اپریل کی خوبصورت رومانوی ٹھنڈی دوپہریں تھیں پٹھانو کو کوئی چودھواں سال لگا ہوگا میں تب بائیس سال کی دوشیزہ تھی، اپنے باپ کی اکلوتی اولاد، حویلی میں میرے جیسی کوئی لڑکی نہیں تھی کہ میں اس کے ساتھ وقت گزارتی۔ لے دے کر اماں اور ان کی گھرکیاں یہ نہ کرو وہ نہ کرو ـــــ ادھر نہ جاؤ ادھر نہ جاؤ۔ ایک پٹھانو کا دم تھا جو میرے لیے غنیمت تھا۔ اپریل کی وہ ایک خوبصورت دوپہر تھی ـــــ چپڑی ہوئی تنوری روٹیاں، لسی، امبیوں، دھنیے، پودینے کی چٹنی، آلو انڈے کے سالن کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اماں اور چچی حویلی کے ٹھنڈے اور تاریک، بھاری لکڑی کے چھتوں والے کمروں کے اندر جا کر ململ کے دوپٹے منہ پر تانے سو گئیں اپریل میں لسی دوپہر کی نیند کے نشے کو دوبالا کر دیتی ہے۔ مجھ پر بھی کھانے کے بعد نیند کا خمار طاری تھا کہ کمرے میں آہٹ سی ہوئی۔ آنکھوں کو خوب کھول کر دماغ کو جگا کر دیکھا تو پٹھانو تھی۔ پٹھانو ہولے ہولے چلتی ہوئی میری پلنگ کے پاس آ کر آہستہ سے بیٹھ گئی، اور سر کو پلنگ کی نیہہ کے ساتھ ٹکا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کیا ہوا پٹھانو؟ میں نے گھبرا کر اس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بولی کچھ نہیں!! مگر سسکیاں لینے لگی کافی دیر بعد وہ سنبھلی تو میں نے پھر ٹٹولا اس دفعہ اس نے بتا دیا ـــــ ہائے میرا دل دھک سے رہ گیا ـــــ اجمل خان میرا بڑا بھائی ـــــ اجمل ہی تھا؟؟؟ ـــــ میں نے پھر پوچھا ـــــ جی باجی وہی تھے ـــــ اس نے سرد لہجے میں بتایا۔

بے اختیار میں نے اس کے بدن کو سہلانا شروع کر دیا۔ شاید میں اپنے بھائی کی طرف سے کیے جانے والے نقصان کا مداوا کر رہی تھی۔ مگر اس طرح کب مداوا ہوا ہے کبھی!!! ارے کم بخت تجھے کیا سوجھی تھی اس بھری دوپہر میں دور دراز کے کھیت میں جانے کی۔ میں نے اسے لتاڑا۔

باجی گندم کے اس کھیت کے اگلے بنے پر گلاب کے پھول ہیں نالی کے اوپر، اماں نے کہا تھا کہ جاؤ پھول توڑ کر لاؤ گل قند بنانی ہے میں پھول توڑنے گئی تھی مجھے کیا پتہ تھا کہ ادھر چھوٹے چودھری صاحب بھی ہوں گے وہ پھر سسک پڑی ـــــ گھر سے تو نکلنا ہی پڑتا ہے ہمارا رزق چار

دیواری کے اندر بیٹھ کر کھانے والوں جیسا تھوڑی ہوتا ہے۔ ہمارا رزق ہمارے پیچھے نہیں آتا ہمیں اس کے پیچھے جانا پڑتا ہے۔ وہ بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے ٹھنڈا پانی مانگا۔ اس وقت میں جس احساس گناہ کے بوجھ میں دھنسی جا رہی تھی وہ مجھ سے کچھ بھی مانگتی میں اسے دے دیتی، مگر بھولی بھالی اور تقدیر کی رضا پر راضی رہنے والی پٹھانو کو بھلا کہاں یہ گر آتے تھے۔ اس حادثے کو بھی اس نے زندگی کا ایک واقعہ سمجھا اور بھول بھال گئی وہ دن ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔

زمین کے ساتھ جڑی بھاری بھرکم اور پراسرار حویلی کے مکین نہ جانے کہاں کہاں اس طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ میں بھی بیاہی گئی۔ حویلی کی قیدی عورتوں کی طرح میرا شوہر بھی زوجیت کے خانے میں مجھے ڈال کر بھول گیا۔ گوشت نہ چڑھتا تو اور کیا ہوتا۔ دو بیٹے پیدا کرنے کے بعد میں پھیل گئی۔ وڈیروں کی عورتوں کے مقدر ٹھہرے ہوئے جوہڑوں کی طرح ہوتے ہیں، نہ چلت پھرت نہ جسمانی مشقت۔ گھر کے کام کاج اور شوہر تو نوکرانیاں سنبھالتی ہیں۔ وڈیریوں کے پاس لے دے کے رسموں رواجوں، زیورات اور بھاری کام والے جوڑوں کا بوجھ اٹھانا ہی رہ جاتا ہے۔ جو بعد میں کولہوں، گھٹنوں اور ٹخنوں کے اندر درد بن کر جم جاتا ہے۔ بے چاریاں بس زیورات اور لباسوں کے عوض گروی رہ کر زندگی بتا دیتی ہیں ___ میں بھی آزاد بنت آزاد تھی لہذا آزادی کی سزا میں نے بھی بھگتی۔ کروٹ لیتی تو ہڈیاں چٹخنے لگتیں، اور میری ہائے پوری حویلی کے اندر گونج جاتی۔

پٹھانو کی بڑی لڑکی میرے بڑے بیٹے کی ہم عمر تھی۔ پٹھانو نے اس لڑکی کے بعد چار لڑکیاں اور پانچ لڑکے مزید پیدا کیے اور میں دو بیٹوں کے بعد ہی ناکارہ ہوگئی۔ اس کی سب سے چھوٹی لڑکی دودھ پر تھی۔ سارا سارا دن وہ پاؤں کے بل بیٹھی نہ تھکتی تھی، اور میں چارپائی پر پڑی پڑی تھکن سے چور ہو جاتی۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کتنے رشک سے آزاد پٹھانو کو دیکھا کرتی تھی اور مجھے اپنی بدترین قید کا کس قدر شدید احساس تھا۔

وقت پر لگا کے اڑتا رہا۔ میں نے بڑے بیٹے کی شادی اپنی بھتیجی کے ساتھ کر دی۔ کئی دن حویلی میں خوب رونق رہی۔ پٹھانو کے تو کئی بیٹے بیٹیاں شادی شدہ تھے اور بال بچے دار بھی، حالانکہ ابھی اس کی اپنی ایک بیٹی دودھ پر تھی۔ اس قوم میں مائیں بیٹیاں، ساس بہویں ایک ساتھ بچے پیدا کرتی ہیں۔ اس کی بہوؤں اور بیٹیوں کا حویلی میں آنا جانا تھا۔ بیٹے کے ہاں پہلی بیٹی کی پیدائش نے حویلی کے ماحول میں افسردگی بھر دی۔ مگر میں خوش تھی۔ مجھے ان دنوں جب میں پوتی کو گود میں لے کر اس کے لمس سے آشنا ہوئی، اپنی تکمیلیت کا احساس ہونے لگا تھا، اب میں پٹھانو سے بھی بیگانہ

ہوگئی، پوتی نے میری تنہائی کو بانٹ لیا تھا، مگر میرے اندر ہمیشہ ایک خوف کنڈلی مارے بیٹھا رہتا تھا ___ غلام بنت غلام کا خوف ___

میں اندیشوں کی زد پہ رہنے لگی تھی ___

میری پوتی کا مقدر بھی میرے جیسا ہوگا ___

ایسے کئی اندیشے دن رات کاٹتے رہتے، مگر کڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی کہاں تھا۔ پہلی کے بعد دوسری اور پھر تیسری پوتی ہوئی تو صف ماتم بچھ گئی۔ بہو کو رگڑا رگیدا گیا۔ ایک میں اکیلی تھی جو چپ تھی۔

بہو چوتھی بار امید سے ہوئی تو وہ مارچ کے آخری دن تھے۔ حویلی کے اندر ایک المناک چپ تھی۔ میرے شوہر چوہدری اختر خان کا پارہ اب چڑھا ہی رہتا تھا۔ وارث کی خواہش نے اس کو بدمزاج بنا دیا تھا۔ اس دن بڑے عرصے بعد چند جملوں کا تبادلہ میرے اور چوہدری اختر کے درمیان ہوا تھا۔ جب اس نے بہو کو یہ کہا کہ وہ لڑکا پیدا کر ہی نہیں سکتی۔

اس کا کیا قصور ہے اختر خان ___ تمہارا بیٹا لڑکا پیدا نہیں کر سکتا۔

اور مجھے اس بات کا جانے کیوں یقین ہو چلا تھا کہ اب کی بار بھی پوتی ہی ہوگی۔ بہو اپنی بیٹیوں سمیت میکے چلی گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں اکیلی اپنی جان کو رو رہی تھی، کھڑکی کے ساتھ ہی میرا بستر تھا، اور کھڑکی کے سامنے میرے بیٹے کا کمرہ تھا۔ جنم جنم کی قیدی نے ایک کراہ کے ساتھ کھڑکی کھولی تاکہ تازہ ہوا کے آنے سے طبیعت کچھ بحال ہو سکے، بے دھیانی میں نظر بیٹے کے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ پٹھانو کی تیسری بیٹی کپڑے سنبھالتی ہوئی میرے بیٹے کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اس کے باہر نکلتے ہی میرے بیٹے نے کمرے کا دروازہ دوبارہ بند کر لیا ___ ایک عجیب سے احساس سے میرا وجود جھنجھنا اٹھا ___

یہ سب کچھ نیا تو نہیں تھا ___ یہ تو ازل سے ہوتا آ رہا تھا۔ مگر مجھے نیا نیا لگا ___ عجیب سی سرشاری اور مسرت نے میرے وجود کے اندر لہر بھر دی ___ خیال نے ایک انوکھی جست بھری۔ میری پانچویں پوتی اپنی دادی کی طرح غلام بنت غلام نہیں بلکہ اپنی نانی کی طرح آزاد بنت آزاد پیدا ہوگی!

جنس گراں

بڑے عرصے سے اس کی عادت تھی بس میں بیٹھتے ہی دائیں طرف والی نشستوں میں سے کھڑکی والی نشست پکڑتی۔کبھی کبھاریوں بھی ہوتا کہ دائیں طرف والی پوری رو میں کوئی نشست خالی نہ ہوتی ایسے میں اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی اس پر گھبراہٹ کا عالم طاری ہوجاتا اوراگر کسی دن بدقسمتی سے نشستوں کے درمیان کی راہداری میں کھڑے مسافروں کے بیچ کھڑا ہونا پڑتا تو یہ اس کی زندگی کا ناخوشگوار اور بدقسمت ترین لمحہ ہوتا اورایسے لمحوں سے اس کو مفر بھی نہیں تھا ایسے لمحات بڑے تواتر کے ساتھ اس کی زندگی میں آتے رہتے تھے وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اور درمیان میں کسی وسیلے کو لائے بغیر براہ راست ہی خداعزوجل کے حضور پہنچ جاتی ۔وہ جس کی رسائی زمین کے عام زمین زادوں تک بھی نہ تھی خدا تک پہنچ جاتی۔

اللہ جی !جوانہیں لوگوں میں پیدا کرنا تھا تو مزاج بھی ان جیسا دیا ہوتا اوراگر مزاج بدل دیا تھا تو حالات بھی بدل دے آخر تو کس دھن میں مگن ہے اللہ میاں جی یہ کردے اللہ میاں جی وہ کردے۔مگراللہ میاں جی کو اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔اس کا کام تو چل رہا تھا لوگوں کے حالات پر توجہ دیئے اوران کے شکوے سنے بغیر بھی ۔اللہ کے ساتھ اس کا تعلق مکمل طور پر یک طرفہ تھا،اللہ کی طرف سے کبھی اس کے شکوے کا جواب نہ آیا تھا جیسے علامہ اقبال کو آیا تھا، یک طرفہ تعلق بھی ایک عذاب کی طرح ہوتا ہے، یک طرفہ چاہت میں مبتلا کردیتا ہے

روگ دشمن کو بھی یارب نہ لگانا دل کا

جب دائیں طرف کھڑکی کے ساتھ والی نشست اس کو مل جاتی تو وہ سارے گلے شکوے بھول جاتی، زندگی کو نفع ونقصان کے ترازو میں تولتی نشست پر بیٹھ جاتی اور پھر جونہی آٹا پیسنے والی چکی

شروع ہوتی اس کی متلاشی نگاہیں اس کو ڈھونڈنا شروع کردیتیں وہ آٹا پیسنے والی چکی سے لے کر اس کے دفتر تک کے سترہ کلومیٹر کے درمیان گھومتا پھرتا رہتا تھا۔کبھی آتا ہوا دکھائی دیتا اور کبھی جاتا ہوا۔ وہ ہمیشہ پیدل چلتا تھا۔ وہ زندگی کو نفع اورنقصان میں تولتی رہتی خدا سے الجھنا تو ایک طرف رہا گھر والوں سے الجھنا بھی اب روز کا معمول بن گیا تھا۔عمر کے ساتھ ساتھ وزن بھی بڑھتا جارہا تھا۔ کیا وزن کے بڑھنے سے آدمی کی قیمت کم ہوجاتی ہے؟

جسم بے ڈھب ہوجائے تو کیا آدم آدمیت کے معیار سے گر جاتا ہے؟ کیا وہ اتنا سستا پڑ جاتا ہے کہ ٹھکرا دیا جائے؟؟؟ آخر یہ نام نہاد شریف، متقی پرہیز گار،صوم وصلوۃ کے پابند، بہو بیٹیوں اور بہنوں کو برقعے اوڑھا کر رکھنے والے جب شادی کرنے لگتے ہیں تو ایک طوائف کے کوٹھے پہ کیوں کھڑے ہوجاتے ہیں؟؟؟

اماں لڑکی وہ لانا جو سولہ سال کی ہو، جس کی بیس انچ کمر ہو، نازک بدن ہو، زلف دراز ہو، اوران چھوئی کنواری ہو۔ یہی ساری ڈیمانڈز گاہک کی نائیکہ سے ہوتی ہیں۔ ارے بیگم جان! گاہک آنٹی نہیں چھوکری مانگتا ہے، پتلی کمر،سولہ کا سن، کنواری،ان چھوئی،طوائف کے نام پر تھوکنے والے اس کا ذکر آتے ہی کانوں کو ہاتھ لگانے والے بھی وہی معیارات لے کر آجاتے ہیں جو بازار حسن میں دکانداری چمکانے کیلئے ایک لڑکی کے پاس ہونے ضروری ہوتے ہیں۔ رنگ سفید ہو،آنکھ بڑی ہو، ناک اونچی ہو،سینہ دودھ پلانے والی عورت کی طرح ابھرا ہوا ہومگر کمر دوشیزہ کی طرح پچکی ہوئی۔ شرافت،تہذیب،علم،دانش جائیں کوڑے کے ڈھیر پر اور پھر یہاں سے تان ٹوٹتی تو رزق اور عہدے پر جا کر ٹوٹتی۔ بڑے بڑے عہدیداروں، صنعت کاروں اور جاگیرداروں کی ڈھلتی عمر کی بہنوں اور بیوہ، مطلقہ بیٹیوں کے بھی بیاہ ہوجاتے ہیں۔

عورت کا بیاہ ہوتا ہی کب ہے؟ بیاہ تو ملوں،زمینوں ،کوٹھیوں، کاروں،عہدوں کا ہوتا ہے یا پھر دنیا کو دکھانے کیلئے یعنی ایک معزز طرز کا مجرا دکھانے کیلئے پرفیکٹ حسینہ ڈھونڈی جاتی ہے جو ساتھ چلتی ہوئی حور لگے چاہے پہلو میں لنگور ہی کیوں نہ ہو۔ برادری، خاندان میں جائے تو ہر قابل ذکر نوجوان اس کا عاشق ہوجائے اور خاندان میں بیٹھی ڈھلتی عمر کی کنواریوں کو اپنی کمر اور پیٹ پر جمی چربی من من وزنی لگنے لگے اور پھر ان معیارات سے نیچے گر کر کہیں سمجھوتہ کرنا پڑ گیا تو گھر میں نوکرانی اٹھا لائے جو سارا دن چولہا جھونکے اور خون جلائے ۔

خون تو وہ بھی جلاتی تھی اور کرتی بھی کیا؟؟؟ لوگ تو ایک طرف رہے جو اس کی کمر پر

چڑھی چربی کو دیکھ کر چپکے سے اٹھ جاتے تھے۔اس کی ماں ہی اس کو نہ ٹکنے دیتی تھی۔۔۔۔۔

خیالات پاک ہو جائیں تو بلند ہو جاتے ہیں

اس کے پاکیزہ بلند خیالات کو ماں جوتے مار کر زمین پر لے آتی یہ ایک عجیب المیہ تھا۔ اس کو کوئی بلندی کی طرف نہ جانے دیتا تھا نہ حالات اور نہ ہی ماں، جب ان دونوں سے مایوس ہو جاتی تو تیسری سمت خدا کی طرف جانکلتی۔مگر خدا کو بھی اس کے پاک اور بلند خیالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔حالات تو نہ بدلے مگر اس کے مشاغل میں ایک اور مشغلے کا اضافہ ہو گیا۔بس میں دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر آتے جاتے اب وہ لوگوں کے پیٹ اور کمر جانچنے لگ جاتی جیسے ہی کوئی مرد یا عورت بس میں سوار ہوتے اس کی نظر فوراً ان کے پیٹ کی طرف لپکتی جانے کتنے ہی بڑے بڑے، گول مٹول، تھرکتے ہوئے، آپریشن زدہ، لٹکتے ہوئے، کسے ہوئے، پھرتیلے، کمر کے ساتھ لگے پیٹ اس نے دیکھ لیے تھے اور جب کوئی مرد یا عورت بس سے نیچے اترنے لگتے تو وہ فوراً اپنی نگاہیں ان کی کمر پر اتارتی موٹی، چربیلی، بے ڈھب، پھرتیلی، چست، غرض طرح طرح کی کمریں بھی اس نے دیکھ لی تھیں وہ حیران ہوتی کہ ہر طرز کے پیٹ اور ہر ناپ کی کمر کے مرد و خواتین شادی شدہ ہوتے تھے۔

''اپنا وزن کم کرو، موٹی دلہن اچھی نہیں لگتی، چالیس سال کی لگتی ہو، محترمہ آپ کی عمر پینتیس سال تو ہو گی، موٹی لڑکیوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔

طرح طرح کے جملے تھے جو اس کو سننے پڑتے۔ ٹی وی پر چلتے اشتہاروں میں لٹکتی، تھرکتی، چست، پھرتیلی اور پتلی پتنگ لڑکیوں کی کمر دیکھ دیکھ کر اس کو خلجان ہونے لگا تھا تنگ آ کر اس نے ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا زندگی کو آسان کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ موٹی لڑکیوں کے ساتھ کوئی شادی نہیں کرتا آخر جب ایک دن اس کی دفتر کی ایک ساتھی نے اس کو کہا تو آگ کا ایک شعلہ اس کے دماغ کے اندر سے لپکا اور پیروں کے ناخنوں سے باہر نکل گیا ''مردوں نے بیوی لانی ہوتی ہے یا مجرا کرانا ہوتا ہے اس سے۔ ہانڈی روٹی، دال دلیہ، گھر کی صفائی، بچوں کی پیدائش تو موٹی لڑکی بھی کر لیتی ہے سمارٹ ہو جاؤ، یہ کرو، وہ کرو سلمنگ سنٹر، ڈائیٹ، شربت، بھاگو دوڑو'' اف خدایا یہ دنیا ہے یا کچرا کنڈی کچرا، کچرا، کچرا، کچرا

وہ ہمیشہ پیدل چلتا تھا۔ ایک ہاتھ میں گندا بوسیدہ ٹاٹ کا گٹو اٹھائے وہ کچرے کے ڈھیروں کے اردگرد منڈلاتا نظر آتا، یا کبھی کسی ڈھیر کے اوپر بیٹھا کچرے کو الٹ پلٹ کر رہا ہوتا تھا سردی، گرمی، دھوپ، چھاؤں بارش سے بے نیاز گٹو کو ایک ہاتھ میں لٹکائے وہ تارکول کی سڑک پر ننگے

پاؤں چلتا رہتا، وہ موسموں سے بے نیاز تھا، فطرت اس کے سامنے سرنگوں تھی ۔وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہتی تھی درخت، کچے پکے مکان، اینٹوں والا بھٹہ، مالٹے کی فیکٹریاں، کینو گریڈنگ اینڈ ویکسنگ فیکٹری، مالٹے کے باغات، پٹرول پمپ کے بعد مذبحہ خانہ آجاتا جہاں ایک دن اس نے قطار میں کٹے کٹیاں اور جھوٹے جھوٹیاں لٹا کر قصابوں کو ان کی گردنوں پر چھریاں چلاتے دیکھا تھا۔ مذبحہ خانے کے بعد نالہ آتا تھا جہاں ایک طرف قصائی جانوروں کا اوجھڑ دھو رہے ہوتے اور دوسری طرف ساتھ والی آبادی کی عورتیں گھروں کے برتن اور بچوں کے پوتڑے دھو رہی ہوتی تھیں اس سے آگے دائیں ہاتھ سڑک پر ایک امام بارگاہ تھی، پتا نہیں اب وہ امام بارگاہ کیسے بن گئی چند مہینے پہلے تک وہاں پیپل کے بڑے درخت کے نیچے سادہ سا اینٹوں کا ایک کمرہ تھا ایک دن کوئی کالے سیاہ تیل سے اٹے ہوئے پیالے اس پیپل کی جڑوں میں رکھ گیا اس سے اگلے دن سبز چولا پہنے گلے میں مالائیں ڈالے ایک فقیر سائیں بھی وہاں حاضر ہو گئے فقیر سائیں اب روز دھونی رمائے وہاں بیٹھے نظر آنے لگے کہ چند دنوں بعد کسی مخیّر نے نلکا بھی لگوا دیا۔ نلکا لگنے کے بعد کالا علم بلند ہوا۔ اور پھر پیپل، علم، فقیر سائیں اور کوٹھڑی کے اردگرد اونچی دیوار آگئی اور پہلا میلہ بھی دھوم دھام سے ہو گیا۔

چیزیں کتنی تیزی سے وجود میں آتی ہیں۔ مگر اس کا مقدر تھا کہ ایک انچ بھی بدلنے کو تیار نہ تھا اور پھر ایک دن اس نے اچانک اس کو امام بارگاہ کے دروازے سے نکلتے دیکھ لیا۔ ایک ہاتھ میں گندہ، شکستہ بوسیدہ گٹو اٹھائے وہ چلا جا رہا تھا اس کے بدن پر صرف ایک شلوار تھی جس کو اس نے گھٹنوں تک اڑس رکھا تھا غلاظت سے اٹی ہوئی تھی۔ اس کی نظر اس کے بالوں کی طرف چلی گئی۔ بے تحاشا بڑھے ہوئے اور آپس میں الجھے ہوئے بال تھے جو کہ مسلسل میل اور مٹی کے ملنے کی وجہ سے لکڑی کی سخت تیلیوں سے بنے گھونسلے کی شکل اختیار کر گئے تھے وہ اتنا ہی دیکھ پائی تھی کہ بس آگے نکل گئی۔ چند دن بعد وہ پھر نظر آیا۔ مگر وہ صرف اس کی ننگی پیٹھ دیکھ سکی۔ وہ وقفوں وقفوں سے نظر آتا رہتا تھا۔ اسی غلیظ شلوار میں بوسیدہ شکستہ گٹو اٹھائے کبھی اس کے گھر اور دفتر کے بیچ کے سترہ کلومیٹر سے باہر نہ جاتا تھا۔ وہیں اسی سڑک پر آتا جاتا دکھائی دے جاتا یا کبھی کسی کچرے کے ڈھیر کے پاس بیٹھا ہوا۔

اور پھر ایک دن اسے تفصیل سے اسے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ دسمبر اور جنوری کے دھند والے دن تھے ان دنوں کینو فیکٹریاں گریڈنگ کے بعد چھوٹے سائز کے اور بیمار مالٹے چھانٹ کر باہر نکال دیتی ہیں۔ جن کو ٹرکوں اور مزدوں میں لاد کر باہر کسی نالے یا کہیں سڑک کے کنارے ڈھیر کر دیا جاتا ہے ۔جہاں سے مزید چھانٹ کر ضرورت مند اٹھا لیتے ہیں اور باقی وہیں گلتے سڑتے

اور بد بو چھوڑتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک دن دو کینو فیکٹریوں کے درمیانی علاقے میں پھینکے گئے ان فاضل مالٹوں کے ڈھیر کے پاس بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا اور بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی نیچے اتر آئے اور ٹائر بدلنے میں لگ گئے۔ یونہی وقت گزاری کیلئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ وہ مالٹوں کے گندے ڈھیر کے پاس گم صم کھڑا بس کو دیکھے جا رہا تھا۔ بوسیدہ گٹھڑ اس کے کندھے کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال کچھ اس طرح سے گڈمڈ ہو گئے تھے کہ اس کے ہونٹ چھپ گئے تھے۔ صرف متوحش آنکھیں اور ستواں ناک نظر آتی تھی۔ کلوں، جبڑوں اور گردن کو بھی بالوں نے ڈھانپ لیا تھا البتہ باقی کا جسم واضح تھا۔ وہ دنگ رہ گئی۔ فلموں میں دیکھے فلمی ہیروؤں اور ولنوں کے ورزشی جسم اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ چوڑے کندھے، پر گوشت سینہ، پتلی کمر، ہموار پیٹ، بازوؤں کی مچھلیاں اور کلائیوں کی رگیں ابھری ہوئی اور بالوں کی ایک ہموار لکیر جو ناف کے نیچے سے لے کر سینے تک آ رہی تھی اور سینے پر آ کر پھیل جاتی تھی۔

جس معیار کا اس کا جسم تھا اس معیار کے جسموں کی تو دکھاوے کی دنیا میں بڑی مانگ ہے۔ ایسے جسم تو کروڑوں میں بکتے ہیں۔ مگر یہ کیسا شخص ہے کہ اس جنس گراں کے ہوتے ہوئے کچرا چنتا ہے۔

شاید نصیب کا جسموں کی ساخت کے ساتھ کوئی سمبندھ نہیں۔ جانے کب پہیہ بدلا اور بس جھٹکے سے چل پڑی۔

اس نے سر کو اگلی سیٹ کی پشت کے اوپر ٹکا لیا اور آنکھیں موند لیں۔

کمرے سے کمرے تک

پہلے پہل جب اس نے ہوش سنبھالا تو کمرے کی چھت کو نہایت کہنہ، بوسیدہ اور دریدہ پایا۔ لکڑی کا پکھر اور بالے کالے چیونٹے کھا چکے تھے۔ گاہے گاہے بھربھری مٹی چھت سے فرش پر ٹپکا کرتی تھی۔ اسی چھت کے نیچے اس کی ماں کے جہیز میں آئے ہوئے دھات کے دو بڑے صندوق سامنے والی دیوار کے ساتھ لکڑی کی کمزور چوکیوں پر دھرے تھے۔ ایک صندوق جس کا ڈھکن پورا تھا۔ اس کے اندر ماں نے اپنی ماں کے ہاتھوں کی بنی دو لائیاں، رضائیاں، دریاں، کھیس، تکیے اور سرہانے رکھ چھوڑے تھے۔ جن کو وہ کبھی کبھار کسی شادی یا فوتگی پر ہی نکالا کرتی تھی یا پھر بدلتے موسموں میں ان کو نکال کر دھوپ لگوایا کرتی۔ جب وہ صندوق کھلتا تو گویا اس کے لئے جنت کا دروازہ کھل جاتا۔ مخمل، شنیل، ویلوٹ، دل پیاس کے اوپرے اور فلیٹ اور کنول کے سادے اندرس لگی رضائیوں کے اندر ایک انوکھی خوشبو ہوتی۔ وہ اپنی مرحومہ نانی (جس کو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا) کی خوشبو ان بستروں کے انڈر ڈھونڈتی ان رضائیوں کے اوپر لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی۔ مگر یہ راحت تھوڑی دیر کے لئے ہوا کرتی تھی۔ ماں اس کو دھکیل کر نیچے پھینکتی اور آنسو بہاتی اپنی ماں کو یاد کرتے ہوئے دوبارہ سارے بستر اس صندوق کے اندر فٹ کر دیتی اور یوں ایک طلسماتی جزیرے کا دروازہ بند ہو جاتا۔ اسی طرح دوسرے صندوق کے اندر جس کا دروازہ آدھا مستقل طور پر بند اور آدھا کھلتا تھا۔ ماں نے روزمرہ کی استعمال کی چیزوں اور کپڑوں کی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ اس کا ڈھکن اٹھاتے ہی عام استعمال کے سرہانے، دریاں، کھیس، چادریں اور جا بجا کپڑوں کی گھٹریاں بندھی نظر آتیں۔ ہر گھٹری کھل جا سم سم کی طرح الا بلا سے بھری ہوتی۔ ماں کو عجیب سی عادت تھی۔ وہ پرانے کپڑے، جوتے کسی کو نہ دینے دیتی اور نہ ہی جلاتی تھی بلکہ ان کو رکھتی جاتی اور یوں اس ایک کمرے کے اندر فضول اور ناقابل استعمال اشیاء کا انبار لگتا چلا جاتا۔ وہ زیادہ تر گھٹریاں بھی اسی طرح کے فالتو پرانے اور ناکارہ کپڑوں سے بھری ہوتی تھیں۔ مگر چونکہ ان کی موجودگی میں اماں کی نفسیاتی راحت تھی لہٰذا

ان کو برداشت کیا جاتا تھا۔البتہ اماں کو کتابوں اور اخباروں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ جب بھی ’’اکرو پھیری والا‘‘ مرونڈا لو، کپ لو، پیالے لو، لوہے کے ساتھ، پلاسٹک کے عوض، ردی کے عوض کی بولی لگاتا ہوا اپنی ٹوٹی ہوئی سائیکل پر گزرتا تو اماں اس کو روک لیتی اور اخبارات اور کتابوں کے عوض کپ خرید لیتی۔ ’’اکرو‘‘ بھی بھرپور ہاتھ دکھاتا اور روپے کا مال آنے میں لے جاتا۔ مگر اماں کو اس کی پرواہ کب تھی۔ وہ تو بقول ان کے گند نکال کر قابل استعمال برتن لے آتی تھیں اور سکھ کا سانس لیتی تھی۔ کمرہ ایک ہی تھا اور وہ چھے بہن بھائی تھے۔ اسی کمرے میں دو صندوقوں کے علاوہ دس چارپائیاں بھی ایک دوسرے کے اوپر جڑی رکھی تھیں۔ ایک اماں کے جہیز کا پرانا سنگل پلنگ بھی تھا جب بھی بارش کا موسم آتا۔ کمرے کی چھت چھلنی کی طرح ٹپک پڑتی۔ اماں بادل کو دیکھتے ہی مٹی کو گوت کر چھت پر پہنچ جاتیں اور خوب خوب موٹا بھاری بھرکم لیپ کرتیں مگر ناسود۔ وہی ڈھاک کے تین پات، بارش برستی تو کمرہ بھوکے چہرے پر مکمل ناآسودگی کی طرح ٹپک پڑتا۔ اماں کے ان بھاری بھرکم تہہ در تہہ مٹی کے لیپوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ چھت پر مٹی کی تہہ اور وزن بڑھتا گیا اور ایک دن عین اماں کی جہیز کی چارپائیوں کے اوپر لکڑی کی پھٹیاں ٹوٹیں اور منوں مٹی چارپائیوں کے اوپر آرہی اور گرد کا ایک طوفان چکراتا ہوا پورے کمرے کے سامان کے اوپر غازے کی طرح بیٹھ گیا۔

وہ ہمیشہ ایک اچھے اور الگ کمرے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ جس کی چھت مضبوط اور پکی ہو اور جس کے اندر وہ اکیلی رہے خوب پڑھے، لکھے اور سوئے۔ مگر یہ خواب ہی رہا اور اماں کا جہیز طوفانوں، برساتوں اور جھکڑوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوتا رہا۔ وہ مٹی کی لالٹین کو سرہانے رکھے زرد ٹی بی زدہ روشنی میں اپنی خوبصورت آنکھوں کو کھپاتی اور پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس کی ماں ساتھ والے بستر میں لیٹی اس کی آنکھوں کو دیکھا کرتی۔ وہ بچپن سے ذرا سانولی اور بے ڈھنگی تھی۔ مگر نین نقش اس کو اللہ نے اچھے دیئے تھے۔ باپ جیسا کھلا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں اور ستواں ناک، سوکھا ہوا بدن، جس پر کھال منڈھی ہوئی لگتی۔ اس کے استخوانی چہرے پر اس کی روشن اور کھلی آنکھیں اس کی ماں کو بڑی عجیب لگتیں اور وہ اس کا مذاق اڑاتی اور بڑے طنز کے ساتھ اس کو ’’اخبار نویس‘‘ کا نام دیتی۔ اس کی پھوپھی کی بیٹیوں اور اس کی اپنی بہنوں کی رنگت صاف اور بدن بھرے ہوئے تھے۔ لہٰذا اس کا سانولا رنگ اور سوکھا ہوا بدن اس کے لئے طعنہ تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ اس کی ماں نے اس کو پیار سے دیکھا ہو۔ وہ ہمیشہ اس پر تنقید کیا کرتی تھی اور اس کو بدبختی کی علامت قرار دیتی۔ مگر وہ ہمیشہ ماں کے حالات، ٹوٹے ہوئے کمرے اور ماں کے جہیز کی ابتر حالت پر کڑھتی اور ان کی بہتری کے طریقے

سوچا کرتی۔ ایک دن ضرور وہ ماں کی حالت کو سنوار دے گی اور جہیز کی بہت حفاظت کیلئے ایک پختہ چھت والے کمرے کا انتظام کردے گی جو چھت سے مٹی اور بارش نہیں گرائے گا بلکہ ماں کے جہیز کے سامان کا محافظ بنے گا۔ مگر ماں اس کے مثبت اور تعمیراتی خیالات سے ناآشنا اس کو طعنوں، معنوں اور گالیوں کی زد پر رکھتی۔ مگر وہ کبھی بھی خود کو ماں کی بہتری کے خیالات سے دور نہ کرسکی۔

وہ اخبارات جو ماں کے نزدیک گند تھے انہی کی بدولت نفرت اور حقارت کے ماحول میں پل کر جوان ہونے والی وہ لڑکی مقابلے کا امتحان پاس کرکے سی ایس پی افسر بن گئی۔ ورنہ اس کے پاس کیا تھا جو اس کو بصیرت دیتا۔ ٹوٹا ہوا کمرہ، اس سے بڑھ کر ٹوٹی ہوئی زندگی، شہر اور گاؤں سے دور جنگل کا بسیرا، جہاں بجلی دو ہزار چھے میں آئی تھی اور اس کے تعلیمی کیریئر کا سولہواں سال خوش بخت سال تھا جس میں اس نے بجلی کے بلبوں کی روشنی میں پڑھا تھا۔ اس کی ماں کو اس سے زیادہ اپنی گائے اور مرغیوں کے ساتھ محبت تھی کیونکہ ان کا پھر بھی کوئی Output تھا مگر اس کا Output کیا تھا؟ ماں کے نزدیک محض وقت کا ضیاع، اس کا باپ اور وہ خود اخبار کی قرأت کی بناء پر تضحیک کا نشانہ بنتے تھے۔ وہ ابھی چھوٹی تھی کہ اس کا باپ لالٹین کی روشنی میں ڈائجسٹ پڑھا کرتا تھا۔ ماں کو اس کا کمزور روشنی میں نظر کھپانا اور وہ بھی جھوٹی کہانیوں پر پسند نہ تھا۔ ماں کہانیوں کو جھوٹ کا پلندہ کہا کرتی تھی اور پھر اس کی ماں نے ایک دن سارے ڈائجسٹ اٹھا کر ایک گٹو کے اندر ڈال دیئے اور اس کا چاچا ان کو سائیکل کے کیریئر پر رکھ کر رات کے اندھیرے میں گیا اور ان کو نہر میں ڈال آیا۔ بعد میں ایک بار وہ خود ماں کی نظروں سے چھپ کر سخت گرمی میں بستروں کے اوپر چھپی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی تو اس کی ماں نے دیکھ لیا اور اس کا ڈائجسٹ جھپٹ کر ’اوہلے‘‘ (وہ مخصوص جگہ جہاں گوبر کے اُپلوں کے اوپر دودھ ابلنے کیلئے رکھا جاتا ہے) کے اندر دہکتے اُپلوں کے اوپر ڈال دیا اور اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے کلیجے کے کنارے جل کر سیاہ ہوگئے ہیں اور اس کا خوشبودار دھواں اس کے لہو میں گھل مل رہا ہے۔ ماں کے سامنے وہ شدید بے بس ہوگئی تھی۔ ماں نے اس کے اندر جھانک کر نہ دیکھا کہ وہ اندر سے کتنی دھواں دھار ہوگئی تھی۔ تب وہ محض تیرہ سال کی تھی آٹھویں کلاس کی طالبہ۔ ننھی منی کمزور سے جسم والی۔ بھلا اس عمر کی نادان بچی اس طرح کی کیفیت سے گزر سکتی ہے؟ ماں کا تجربہ تو یہی بتاتا تھا۔

کون کہتا ہے کہ مائیں دلوں کے اندر چھپے دکھ تک جان جاتی ہیں۔ مائیں بھی مالک کی طرح بے نیاز ہوتی ہیں۔ وہ اپنی مخلوق سے صرف تابعداری مانگتی ہیں۔ بندگی اور عبادت گزاری مانگتی ہیں۔ نافرمانی ہوجائے تو دوزخ دہکا دیتی ہیں۔ الٹا لٹکا دیتی ہیں۔

افسر ہونے کے بعد سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ کمرے کی چھت بدلنے کا تھا۔ آغاز جو کہ کمرے کی چھت بدلنے سے ہوا تھا اس کا اختتام ایک نئے مکان کی تعمیر پر ہوا۔ نئے مکان کی تعمیر کے بعد گھر کھلا ہوگیا اور کئی کمرے بن گئے۔ اور اس ترقی میں اس کا بڑا بھائی بھی شامل تھا۔ کمرے کی چھت بدلنے کے بعد اس کی دیواروں پر نئی سفیدی کروائی گئی۔ فرش دھویا گیا اور کھڑکی بھی بدل دی گئی۔ جب کھڑکی اور دروازے پر پینٹ ہوا تو کمرہ بالکل نیا نیا لگنے لگا۔ اس کی بوسیدگی کہیں دور بھاگ گئی۔ اماں کا جہیز ساتھ والے کمرے میں منتقل ہوگیا اور ان کا پلنگ اسی کمرے کے اندر رہ گیا۔ نئے نئے کمرے کے اندر پرانا پلنگ بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ مگر کیا ہوسکتا تھا مجبوری تھی۔ پلنگ کے اندر کی دنیا تو وہی رہی مگر اس نے تکیے اور پلنگ کی چادریں بدل دیں تو پلنگ کی بوسیدگی بھی چھپ گئی اور وہ بھی نیا نیا لگنے لگا۔ اب اس کمرے میں کل سامان وہ پلنگ اور ایک لوہے کی پرانی الماری تھی۔ لوہے کی الماری بھی بوسیدہ ہوچکی تھی۔ جیسے تیسے وقت اور گزر گیا۔ ایک جستی ٹرنک جس کے اندر کتابیں دھری رہتی تھیں اس پلنگ کے پیچھے پڑا رہتا۔ اس کو آئے روز ان کتابوں کیلئے ایک الماری کا خیال رہنے لگا مگر الماری کیسے آتی کہ نئے گھر کی تعمیر کے بعد ساری پرانی چیزیں بے معنی اور بے کار لگنے لگی تھیں۔ اب تو ماں کے مطالبے بھی آئے روز بڑھنے لگے۔ فلاں چیز پرانی ہوگئی ہے، نئے گھر میں بری لگتی ہے۔ فلاں چیز بھی اب نئے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔ اور وہ ان کا مطلب فوراً سمجھتے ہوئے بغیر کسی حیل وحجت کے وہ نئی چیز لا کر گھر میں رکھ دیتی۔ گھر میں نئی چیزیں تو آتی گئیں مگر ماں کی وہی ازلی فطرت کہ اس کو پرانی چیزوں کے ساتھ خدا واسطے کی محبت تھی۔ یوں ایک طرف گھر نئی چیزوں سے بھرتا گیا اور دوسری طرف پرانی چیزوں کے انبار میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب گھر کا، کمروں کے سامنے کا برآمدہ کسی کباڑیے کی دکان کا منظر پیش کرتا۔ پرانی گھڈیاں، الماریاں، دیوار سے اکھڑی گرل، گھڑے، گندم کا بھڑولہ، پرانی سائیکل، کنس کے اوپر رکھی دوائیوں کی خالی اور بھری ہوئی شیشیاں، پرانے اخبار، جوتے، کپڑوں کے گٹو، اُکھڑی ہوئی ٹوٹی ہوئی کرسیوں کے ڈھانچے، بجلی کی جلی ہوئی پرانی تاریں، گٹو کے ٹاٹ، شہتوت کے ٹوکرے اور اس طرح کی ہرالا بلا اس کے اندر نظر آتی۔ اس نے بہت دفعہ اس کاٹھ کباڑ کو ختم کرنے اور گھر کو صاف رکھنے کی بات کی۔ مگر بات اس کے منہ میں ہی ہوتی کہ ماں آگ بگولہ بن کے اس کے سر کو آجاتی۔ اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ گھر ماں کا ہے اس کا نہیں اور وہ خواہ مخواہ ہی ماں کے گھر کو بدلتے بدلتے خود کو بوڑھی کرتی جارہی ہے۔ مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ افسر بن گئی تھی۔ ماں کو دوسری بیٹیوں کے دان دہیز

اور بیاہ کی فکر رہتی اور وہ اکثر سوچتی کہ آخر اس نے ماں کا کیا بگاڑا ہے۔ روزِ اول سے وہ ماں کے حالات کو بدلنے اور اس کی بہتری کا سوچتی آرہی ہے۔ مگر ماں کو اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ماں کا شاید خیال تھا کہ جو اولاد اچھا کمانے لگے اس کو ماں باپ کے سہارے یا دعاؤں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

پھر ایک دفعہ کسی خیال کے تحت اس نے اپنے کمرے کیلئے کچھ اور سامان خریدا اور اس کو اپنی ضرورت کے مطابق رہنے کے قابل بنا لیا اور کمرے کے اندر ہی رہنے لگی۔ کمرے کے باہر کے ماحول سے اس کی دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی۔ کمرہ اس کا ساتھی تھا۔ اس کے اندر اس کا بستر تھا۔ کتابیں تھیں اور کپڑے تھے۔ اس سے زیادہ سرمایہ تو اس کے پاس تھا نہیں۔ جو گنتی کی اشیاء تھیں وہ ساری اس ایک کمرے کے اندر سما جاتی تھیں۔ گزرتا وقت ساری چیزوں میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ کمرے کے باہر اس کی لائی ہوئی چیزوں میں اضافہ ہوتا رہا اور کمرے کے اندر اس کی تنہائی اور بالوں کی سفیدی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کا سارا وقت اپنی کتابوں اور تنہائی کے ساتھ گزرتا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ خون کے رشتے ناطے تو محض روپے اور خوشامد کے ساتھ بندھے ہیں یہ نہ ہو تو رشتے ختم ہوجاتے ہیں اور خون سوکھ جاتے ہیں۔ ماں کا وہ کمرہ جس کی حالت زار پر ہمیشہ اس کو رحم آتا تھا اور جس کو بدلنے کی اس نے ٹھانی تھی اور واقعی اس کو بدل بھی دیا تھا۔ اب اس کو قید کی طرح لگنے لگا۔ اس کو لگتا کہ جیسے اس نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے لئے ایک قید خانہ تیار کر لیا تھا۔ اس کمرے کے اندر لائی ہوئی ترتیب کے ساتھ رکھی اس کی چیزیں اور کتابیں ان کے ساتھ وہ بندھ گئی تھی اور یہ بندھن ایسا تھا کہ اس کو کسی دوسرے بندھن کی طرف جانے کا سوچنے بھی نہ دیتا تھا۔ وہ کمرے کی چار دیواری کے اندر رکھی اشیاء اور کمرے کی محبت میں گرفتار ہو کر ان دیواروں کی قیدی بن گئی تھی۔ پھر ایک دن اچانک اس کو خیال آیا کہ اس کو یہ جیل توڑ کر بھاگ نکلنا چاہیے۔ آخر ایک کمرہ ہی تو تھا اور ایک کمرے میں زیادہ سے زیادہ کتنی چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کو چھوڑنا مشکل ہو۔ انسان کی ملکیت میں کم چیزیں اور اسباب ہو تو اس کو گھر ہی نہیں بلکہ دنیا چھوڑنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے کمرے کے اسباب کو باندھا، کپڑے، کچھ جوڑے جوتوں کے، کتابوں کے دس بارہ بنڈل، تصویروں کے ایک دو البم ایک چھوٹی سی گاڑی کرائے کی منگوائی اور کمرے کی قید سے ہمیشہ کیلئے آزاد ہوگئی۔

اور اگلے دن ماں نہ جانے ممتا کے کون سے جذبے کے تحت اس کو جگانے اس کے کمرے میں گئی تو وہ خالی پڑا تھا اور کمرے کی قیدی آزاد ہوچکی تھی۔

سیملے کپڑے

تم نے محبت کی، نفرت کی، غربت اور امارت کی، علم اور جہالت کی، رویوں اور جذبوں کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ ان سب کے اندر ایک اور کا اضافہ کر دینے سے کیا ہو گا۔ کچھ بھی نہیں۔تو چلو آؤ آج میں تمہیں قاری سے ناظر بناؤں اور تمہیں کچھ منظر دکھاؤں۔

دیکھو! سیم نالے کے پل کے اس آہنی جنگلے پہ کہنیاں ٹکا کے نیچے دیکھو، یہ برساتی نالہ ہے جو برسات کے علاوہ عام دنوں میں خشک رہتا ہے اور اس کے کنارے پر آباد لوگ اپنا سالانہ ایندھن اس کے اندر جمع کیے رکھتے ہیں۔ وہ سامنے گندے اُلجھے بالوں پہ میلے پرانے کپڑے کی دھجی کس کے باندھے، دوپٹے اور شلوار سے بے نیاز وہ جو نوجوان عورت بیٹھی اپنے ہی پاخانے میں انگلیاں چلا رہی ہے۔ یہ رفعت ہے، یوں سمجھو میری بچپن کی ہمجولی۔

اس کے شوہر نے اس کی کوکھ میں بچہ ڈال کے چھین لیا اور یہ خالی ہوگئی۔ ہاں جیسے کسی یو ایس بی کے اندر سے سارا ڈیٹا فارمیٹ ہو جائے۔ عورت اپنی کوکھ کے ساتھ اتنی کیوں جڑی ہوئی ہے۔ وہ کوکھ سے ہی سوچتی ہے اور جب کسی عورت کی کوکھ ڈیٹا بھری یو ایس بی کی طرح فارمیٹ ہو جاتی ہے تو وہ بھی اس یو ایس بی کی طرح بے مصرف کیوں ہو جاتی ہے؟؟

رفعت اب بالکل Blanck ہے۔ اس کی ماں انور بھی اسی طرح خالی ہو کے مر گئی تھی اور اُس کی نانی ''کرشید'' یہ نام تو غالباً ''خورشید'' سے پڑا ہے۔ ہاں تو کرشید بھی خالی خولی ہے مگر اتنی بھی نہیں۔ وہ سیم نالے کے پُل سے تھوڑا آگے نہری کھال کے اوپر لگے نلکے پہ اکثر کپڑے دھوتی نظر آتی ہے۔ یہ کپڑے جانے کس قسم کے ہیں کہ کبھی صاف نہیں ہوتے۔ کیسے صاف ہوں، بوڑھی ناتواں عورت کے پاس صابن، سوڈا یا سرف کی طرح کی کوئی چیز تو ہوتی نہیں کہ ان پہ مَل کے اُن کے اندر

جما میل نکال سکے۔

وہ بس کپڑوں کو پانی سے گیلا کر کے لکڑی کے ڈنڈے سے کوٹتی رہتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک ہاتھ سے نلکا چلا کے اوپر پانی ڈالتی جاتی ہے۔ اس نلکے کے اوپر کیکروں کا ایک جھنڈ ہے۔ جس کے بالمقابل ایک کچا راستہ گاؤں کو جاتا ہے۔ راستے کے ساتھ یا پھر نہری کھال اور راستے کی تکون کے اندر حنیف کی کچی کوٹھری ہے۔ جسے سارا سال تالا پڑا رہتا ہے۔ کیوں کہ حنیف گندم کا سیزن نکالنے کے بعد اپنی بیوی اور اپنی نواسی کے ساتھ کراچی چلا جاتا ہے۔ اس جھگی کے صحن میں جنگلی گھاس اور ایک خودرو کھجور اُگ آئی ہے۔

اس جگہ کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہاں بیٹھ کر سکندر اعظم نے لسی کے کئی گلاس چڑھائے تھے جو کہ مبینہ طور پر ہمارے ہی ڈیرے سے آئے تھے۔ ارے بھیا! اگر سکندر اعظم پنجاب کی سیکڑوں جگہوں پہ اپنی نشانیاں چھوڑتا رہا تو یہاں بھی تو آیا ہوگا۔ کہیں اُس کے گھوڑوں نے نمک چکھا، کہیں اُس نے چھینک ماری، کہیں ماتھے کا پسینہ گرایا [1] — خیر حنیف کی بات کرتے ہیں، تو حنیف اگر اس جھگی کو تالا نہ بھی لگاتا تو کوئی حرج نہیں تھا کہ آخر اُس میں ایسا ہے تو کچھ بھی نہیں جو چرایا جا سکے۔ مگر حنیف پھر بھی تالا لگا کے جاتا ہے، اچھا کرتا ہے۔ اس سے اُس کی جھگی کی طہارت تو قائم رہتی ہے اور ساری ناپاکی کماد کے کھیتوں اور بھوسے کی دھڑوں کے خالی حصے میں پھیلتی رہتی ہے۔

وہ مجید دادا ہیں جو جانوروں کے لیے بھوسہ ڈالنے آتے ہیں تو اپنی دھڑ کا خالی ٹک دیکھ کر ایک دفعہ زور سے تھوکتے ہیں۔ زبان کو پاک کرنے کے بعد (واضح رہے کہ یہ تھوکنا نفرت کے لیے نہیں بلکہ زبان کی طہارت کے لیے ہے) وہ کلمہ پاک کا ورد کرتے ہیں۔ کلمہ پڑھنے کے بعد وہ اُن آوارہ کتوں کو خوب بے نقط اور بے لباس گفتار سناتے ہیں جنہوں نے تمام رات اُن کے پاکیزہ ٹک کے اندر الٹم پلٹم اور دھینگا مشتی کی تھی۔ جانوروں کے جنسی اعضاء کو انسانوں کے اعضا کے ساتھ جوڑتے ہوئے اُن کی زبان کبھی ناپاک نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کبھی سور یا خنزیر کا لفظ بے احتیاطی سے منہ سے ادا ہو جائے تو باقاعدہ کلی کر کے پورے تین کلمے پڑھتے ہیں، کتنے پاکیزہ اور پوتر ہیں مجید دادا۔

اور وہ فوزیہ ہے۔ جو گھر سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے کھڑی ہے اور ایک ایسی پیٹھ کو دیکھ رہی ہے جو اُس سے دور جا رہی ہے۔ کیا کبھی کسی نے پیغام رسانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا ہو گا۔ فوزیہ جس لڑکے کو پیٹھ پھیر کر جاتے ہوئے دیکھ رہی ہے وہ اُس سے اتنا دور ہے کہ اُس کی آواز نہیں

سُن سکتا، فوزیہ کے پاس موبائل بھی نہیں کہ اس کو فون کر لے۔ وہ دوسری طرف سے آنے والے موٹر سائیکل سوار کو ہاتھ دے کر روکتی ہے اور اُسے کہتی ہے کہ

''بھائی! وہ آگے جو لڑکا سفید کپڑوں میں پیدل جا رہا ہے اُس کو روک کر یہ پیغام دینا کہ پیچھے مڑ کر اُس لڑکی کی طرف دیکھے۔''

وہ لڑکا پیغام لے کر کِک لگاتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے اور پھر اُس سفید کپڑوں والے کے پاس رُک کر کوئی بات کرتا ہے۔ پیچھے مڑ کر اشارہ کرتا ہے اور ہوا ہو جاتا ہے۔ فوزیہ کولہوں پہ ہاتھ رکھے بڑے اشتیاق سے یہ منظر دیکھ رہی ہے۔ سفید کپڑوں والا الٹے قدموں واپس چل پڑتا ہے۔ فوزیہ کے چہرے پر جو روشنی ہے وہ دیکھے جانے کے لائق ہے۔

آج گھر سے نکل کر سڑک تک آتے وقت پیدل چلتے ہوئے میں نے ایک خوفناک چیز دیکھی ہے۔ چلتے وقت میں اپنی نظریں اپنے قدموں کے آگے کے راستے پہ رکھتی ہوں۔ آج میرا پاؤں ایک خطرناک رینگنے والے جیو پر پڑنے والا تھا کہ رُک گیا۔ یہ پلپلا سا بالکل جیلی کی طرح اور انسانی انگلی کے برابر لمبا اور موٹا ایک کیڑا ہے جو کہ خشک برساتی نالے سے نکل کر کچے راستے کو کراس کر کے دوسری طرف نہری پانی کی کھال کی طرف جا رہا ہے۔ یہ کیڑا اپنی دُم کی طرف سے لچکیلے نرم پانی جیسے مادے کی باریک تار چھوڑے جا رہا ہے۔ میں خوفزدہ ہوں۔ میں نے ایسا جیو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں کیکروں کے جھنڈ کے نیچے آ کر کھڑی ہو جاتی ہوں جہاں سے مجھے شہر سے آنے والی بس میں بیٹھ کر اپنے دفتر جانا ہے۔

میرے پسِ منظر میں جہاں پہلے بابے کرم دین کا فی سبیل اللہ لگوایا ہوا نلکا ہوا کرتا تھا۔ جس پر کرشید بغیر صابون، سرف کے کپڑے دھویا کرتی تھی، اب نہیں ہے۔ اب وہاں صرف یادگار کے طور پر ایک کھرے کے ٹوٹے ہوئے آثار رہ گئے ہیں۔ نلکے کی مشین تو کسی نے اتاری ہی تھی۔ اب زمین کے اندر گڑی لوہے کی نال بھی کوئی نکال کے لے گیا ہے۔ جہاں میں کھڑی ہوں یہاں میں نے شہر کے لیے بس کا انتظار کرنے والے مسافروں کی خاطر سیمنٹ کا ایک بینچ رکھوانے کا سوچا تھا مگر جب نلکے کی مشین چوری ہوئی تو میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور جب نال بھی غائب ہو گئی تو میرا بینچ نہ رکھنے کا ارادہ اور بھی قوی ہو گیا۔

دیکھیے کسی ایک کا عمل کسی دوسرے کے ارادے پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ عجیب و غریب کیڑا اب بھی میرے تصور میں رینگ رہا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے حرام مغز سے شروع ہو

کر ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے تک دوڑ گئی ہے اور وہ اُدھر دیکھو! وہ لمبے قد اور بے ڈھنگے جسم کا ملنگ جو جا رہا ہے اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔ ایک مُڑے ہوئے ٹیڑھے ہاتھ کو کمر پہ رکھے، گلے میں موٹے منکوں کی مالائیں ڈالے، سر پہ رنگ برنگی ٹکڑیوں سے سِلی ٹوپی پہنے یہ اسی طرح تمام پہر گھومتا ہے۔ یہ جو سیم نالے اور سڑک کے ملنے والے دونوں کناروں میں بننے والی تکون ہے نا، جہاں اینٹوں کی ایک تکون چار دیواری کے اندر کالا علم لگا ہوا ہے نیچے ایک دیا بھی پڑا ہے۔ اس علم والی تکون چار دیواری کے ساتھ ونٹر کے بڑے درخت کے نیچے رفعت کا گھر ہے۔ دو کمروں کا گھر جن کے دروازے نہیں ہیں۔ رفعت کے گھر کی پچھواڑی کے ساتھ جُڑا کالونی کا سب سے اونچا اور پختہ یہ جو گھر بنا ہوا ہے اس میں اس ملنگ کی ماں رہتی ہے۔

ملنگ کی ماں کا نام ''رشیداں'' ہے۔ رشیداں رفعت کی سگی پھوپھی ہے اور اس کی ساس بھی۔ اِسی کے بیٹے نے رفعت کو پاگل کر کے گھر سے نکالا تھا اور وہ ایسی بے گھر ہوئی کہ پھر کبھی واپس نہ آئی۔ رشیداں بستی کی سب سے کھاتی پیتی عورت ہے۔ وہ اونچے اور پکے گھر میں رہتی ہے۔ کیوں کہ اُس کے تین بیٹے کراچی میں برتن دھونے والے کالے صابون کی فیکٹری چلاتے ہیں۔ انہوں نے وہیں تین مرلے کا تین منزلہ گھر بنا لیا ہے جو یہاں کچی بستی میں کوٹھی یا غالباً بنگلہ مشہور ہے۔ رشیداں کے گھر میں بیت الخلاء بھی ہے۔ وہ ہمیشہ کالے کپڑے پہنتی ہے اور اپنے اس ملنگ بیٹے کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔ آج شام کو رشیداں نے اماں کو نہ جانے کیا بات بتائی ہے کہ اُپلوں پہ اُبلے دودھ کی تھری جمونی میں ڈالتے وقت وہ ڈگمگا گئی ہیں۔ مجھے اماں کا جملہ سنائی دیتا ہے۔ وہ رشیداں کو کہہ رہی ہیں کہ ''تو ثواب کے لیے کرتی ہے مگر یہ تو الٹا گناہ ہے رشیداں!''

غالباً رشیداں نے اماں کو بتا دیا ہے کہ وہ اپنے جوان ملنگ بیٹے کی زیرِ ناف صفائی کے لیے اُسے نلکے کے نیچے بٹھا کے بالصفا پوڈر گھول کر اُس کی ٹانگوں کے بیچ ڈالتی ہے، وہ تڑپتا ہے، اُچھلتا ہے، ہاتھ مارتا ہے، یوں صفائی ہو جاتی ہے۔ رشیداں تو ثواب کمانے کے لیے ایسا کرتی ہے مگر اماں کہتی ہے: ''نہیں رشیداں! اُسے یونہی چھوڑ دے۔ اُس کا کون سا دماغ ہے کہ سزا جزا کا یا پاکی پلیدی کا پتا ہو، رب اُسے معاف کر دے گا، مگر تو ایسا نہ کیا کر، گناہ ہوتا ہے۔''

دیکھو رشیداں کو گناہ اور ثواب کا کتنا احساس ہے مگر رفعت ـــــ مجھے اُس کا بہت خیال رہتا ہے۔ وہ میری بچپن کی ہم جولی ہے۔ ہم ساتھ ساتھ کھیلی ہیں۔ رفعت کے اُلجھے گندے بالوں والے سر میں دماغ نہیں مگر اُس کا بدن بے حد چست اور بھرپور ہے۔ دوپٹے سے بے نیاز میلے

چیکٹ شلوار قمیص میں سے اُس کی جوانی کا جوبن لو دیتا رہتا ہے۔ میری آنکھیں اُس کی نگرانی کرتی رہتی ہیں۔ میں اُس کے اردگرد چیکی آنکھوں کو دیکھنا چاہتی ہوں مگر حوصلہ نہیں ہوتا۔

مجھے معلوم ہے کہ سڑک سے گزرنے والی ہر آنکھ اور ہر مقیم اور ساکت آنکھ اُس کے بدن پر لگی ہے مگر میں ان آنکھوں کو اُس کے جسم سے نہیں ہٹا سکتی۔ یہ مکھیاں یا جوئیں تو ہوتیں تو میں کوئی سپرے لے آتی اور مار دیتی مگر یہ تو بے وجود موجودگیاں ہیں۔ ان کا احتساب تو اوپر والا ہی کر سکتا ہے۔ میں تو صرف منظر دِکھا سکتی ہوں۔ مناظر میں تبدیلیاں لانا تو میرا کام نہیں ہے، ہاں مگر میرے پاس اتنا اختیار ہے کہ ان مناظر سے پیٹھ پھیر کر سیم نالے کی پل کے دوسری طرف ہولوں، تو چلو آؤ اب دوسری طرف چلتے ہیں۔ یہ جو سامنے گھر ہے یہ اُس سفید کپڑوں والے لڑکے کا گھر ہے جس کو اُس دن فوزیہ بلا رہی تھی۔ یہ فوزیہ کا کیا لگتا ہے مجھے کیا معلوم۔ اس کے اور بھی تین بھائی ہیں جو دماغ سے نہیں بلکہ بازوؤں سے سوچتے ہیں وہ سارا دن بھینسیں چراتے اور چارہ کاٹتے ہیں اور بڑے دبنگ سوٹے مار ہیں۔ وہ ہمیشہ سوٹے کی زبان سے بات کرتے ہیں لیکن جب میں اُن کے گھر کے قریب سے کچے راستے سے گزر رہی ہوتی ہوں تو اُن کی نظریں جھک جاتی ہیں جانے کیوں؟ مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ شاید اُن کی رگوں میں ہل جوتنے اور چارہ ڈالنے والوں کا خون ہے۔ اس گھر سے پار اگلی طرف وہ جو نئی کوٹھی بنی ہے یہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب کی ہے۔ یہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب چند سال پہلے نائب تحصیلدار ہوئے تھے۔

یہ حادثہ ہوا ہی تھا کہ اُن کے پیچھے گاڑیاں دوڑنے لگیں اور پھر انہوں نے ایک کرنل کی چالیس سالہ، یتیم، کنواری، سکول ٹیچر سالی سے شادی کر لی اور ایک دم ایک کرنل کے ہم زلف بن گئے۔ وہ زمانہ جرنیلوں کی حکومت کا تھا۔ نائب تحصیلدار کو تحصیلداری کرتے کوئی دو سال کا عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ کسی پی۔ سی۔ او کے تحت اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے اور ابھی تک کمشنر ہیں۔ اُن کی اور میری تنخواہ برابر ہے۔ میں جب پیدل گھر سے سڑک تک جا رہی ہوتی ہوں تو وہ میرے پاس سے بڑی سی گاڑی میں زن کر کے گزرتے ہیں۔ خدا کے نظام میں بڑی وسعت ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب کی کوٹھی سے کوئی پانچ ایکڑ اِدھر سیم نالے کے ساتھ یہ جو گھر ہے یہ گلزار کا ہے۔ گلزار تین بار دبئی جا کر واپس آ چکا ہے۔ یہ غیر قانونی طریقے سے جاتا ہے اور وہ قانونی طریقے سے واپس بھجوا دیتے ہیں۔ گلزار اب دبئی سے مایوس ہو چکا ہے۔ اُس نے ٹیوب ویل چلانے والے پیٹر انجن ٹھیک کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ گلزار کا دن اور رات کا کام چل رہا ہے۔

رات کو وہ پچھلے پہر نکل جاتا ہے اور دو تین پیٹر انجنوں کے پرزے ڈھیلے کر کے، کچھ پرزے اُتار کے ساتھ لے آتا ہے یا پھر اِدھر اُدھر پھینک دیتا ہے۔ صبح اُن ڈیزل انجنوں کے مالک اس کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ تب وہ بڑے اعتماد سے اللہ کا نام لے کر جاتا ہے اور انجن ٹھیک کر کے مزدوری وصول کر لیتا ہے۔ اُس کا کام اچھا چل رہا ہے۔ بس خدا اِسے توفیق دے دے۔

آج پھر میں نے وہ خوفناک، مکروہ، پلپلے کیڑے دیکھے ہیں۔ آج وہ تعداد میں کئی تھے۔ ہر دوسرے قدم پر تھے۔ میں نے گھر واپسی پر ماں کو بتایا ہے کہ میں کچھ عرصے سے اس طرح کے کیڑے دیکھ رہی ہوں۔ میں خوفزدہ ہوں۔ مجھے وہم ہوتا ہے کہ یہ کیڑے میری شلوار میں گھس رہے ہیں۔ ماں نے حوصلہ دیا ہے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ''سیملا کیڑا'' ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کھارا پانی ہماری زمینوں کے نیچے گھس آیا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ یہ زمین تو زرخیز تھی۔ میرے دادا کے زمانے میں تو یہاں بڑا بڑا باجرہ، جوار، گندم، شٹالہ، لوسن، رجکا، جودری اور جنتر ہوا کرتے تھے۔ ماں بھی پریشان ہے۔ تیرا چاچا جب سے نہری پانی بیچنے لگا ہے۔ زمین سیملی ہوتی جا رہی ہے۔ میں اب خوابوں میں بھی یہ کراہت آمیز مخلوق دیکھنے لگی ہوں۔ کیڑے ہی کیڑے ہیں۔

پلپلے، لچک دار اور مکروہ کیڑے میرے چاروں طرف بکھر گئے ہیں۔ میری چارپائی کے اوپر پڑے میرے بدن کے گرد انہوں نے اپنی دم سے نکلنے والی لیس دار تار سے جال بن کے مجھے جکڑ دیا ہے اور اب ہر طرف منڈلا رہے ہیں۔ میرے جسم کے سبھی حصوں میں رینگ رہے ہیں۔

میرے پیارے ناظر! تم کہاں بھاگ رہے ہو۔

اوہ خدایا! مجھے گھن آ رہی ہے۔

ماں!!! مجھے اُبکائی آ رہی ہے۔ مجھے بچا لو ماں!!

تم کہاں بھاگ رہے ہو میرے پیارے ناظر! ابھی تو بہت سے منظر باقی ہیں۔ میں جانتی ہوں اب تم میں باقی منظر دیکھنے کی سکت نہیں رہی۔ ہر طرف کیڑے پھیل گئے ہیں۔ مگر وہ ایک آخری منظر تو دیکھتے جاؤ۔ دیکھو! سیم نالے کا پُل، جس کے دونوں طرف کے منظر ہم نے دیکھے ہیں۔ اُس کے نیچے دیکھو۔

دیکھو اُس پُل کے نیچے رفعت بکھری پڑی ہے۔

اور اُس کی دونوں کھلی ٹانگوں کے بیچ میں ____

''سیملے کیڑے''

کبالہ

تو یوں ہے کہ وہ ایک فنکار کی باہوں میں مرگئی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اُس نے ایک نیا حکمنامہ حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ میں عدالت کی بجائے عدالتِ عالیہ کا لفظ استعمال کروں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اُسے عدالتِ عالیہ سے بڑی اُمیدیں تھیں کہ وہ اُس کی بات ضرور سنیں گے اور ایسا قانون ضرور جاری کریں گے جس کے نفاذ کی وہ خواہاں تھی۔ یہ جانے بغیر کہ کیا آزاد اور مہذب معاشروں میں اس طرح کے کسی قانون کی جگہ بھی ہے یا نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ آخر وہ اپنے رومانیت زدہ خوابوں کی تکمیل کے لیے قانون کی راہ کیوں اپنانا چاہتی ہے۔ کیا سماج کی نظر میں معزز کہلانا اتنا ہی ضروری ہے۔ اگر بہت ضروری ہے تو پھر وہ اپنی خواہشات کی تکمیل چور راستوں سے بھی تو کر سکتی ہے، جیسے ازل سے آدم وحوا کی اولاد کرتی آئی ہے اور معزز بھی کہلاتی رہی ہے۔ مگر اُسے وہ تمام آرزوئیں قانوناً جائز اور مبنی برحق ہو کر پوری کرنا تھیں تا کہ وہ قابلِ تقلید بن سکے اور اُس کے بعد آنے والیوں کو کوئی مسئلہ نہ رہے۔ اُس کی یہ خواہشات کیا تھیں؟ آپ کو ضرور تجسّس نے گھیر رکھا ہوگا۔ یہ خواہشات تھیں یا محض کچھ سوال تھے۔ کچھ ایسے سوال جن کے جواب حاصل کرنے کے لیے تجربہ لازم ٹھہرتا ہے۔ میں اُن سب سے واقف ہوں۔

میں اُس کی مختصر زندگی کی تمام جزئیات سے واقف ہوں۔

اُس وقت سے لے کر جب وہ ایک یہودی ربی کی کشتۂ تیر نظر بنی ــــــ اُس وقت تک جب اُس نے ایک فنکار کی باہوں میں آخری ہچکی لی۔

تالے کم رکھو، چابیاں تھوڑی لگانی پڑیں گی۔

اگر تمہارے پاس دو تالے ہیں تو چابیاں بھی دو ہی ہوں گی۔ اگر پہلی بار چابی غلط لگی ہے تو اگلی بار لازماً درست ہی لگے گی۔ کیا اس میں کوئی شک ہے؟

وہ ایک یہودی عالم تھا جو برلن کے ایک کمیون کے اندر تالمود کی تشریحات کر رہا تھا۔ کبالہ کی روشن یا پھر تاریک زندگی کا آغاز (اور یہاں روشن اور تاریک کا فیصلہ قاری پر ہے کہ وہ کیا طے کرتا ہے) اُس یہودی عالم کے اونچے قد اور دلکش آواز سے ہوا۔ اپنے سنہری بالوں پہ دُھندلے نیلے رنگ کا اسکارف جمائے وہ وہیں بیٹھی بیٹھی تحلیل ہوگئی۔ اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ کے اوپر تھا۔ میں نے اُس کی ہتھیلی کو گیلی ہو کر ٹھنڈی پڑتے محسوس کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ تیرِ نظر چل چکا ہے اور پھر اُس کے بعد کبالہ کی آرزوئیں، خواب یا پھر وہ سوال شروع ہو گئے جو آگے چل کر اُس سارے المیے کی بنیاد بنے۔

وہ سوال اُس نے عدالت میں اُٹھانے سے قبل مجھ سے ہی کیے تھے۔

اُس سانحہ میں حکم یعسوف کے ساتھ میں بھی گُھن کی طرح پس گئی تھی۔ حکم یعسوف پہ مر مٹنے کا یارا مجھ میں نہ تھا۔ کیونکہ میں ضرورت سے زیادہ خوبصورت اور با اختیار لوگوں سے خوف کھاتی ہوں۔ یہ میرا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ عہدہ، طاقت اور حُسن خوف میں مبتلا کرتے ہیں اور جہاں خوف ہو وہاں محبت نہیں ہوتی۔ میں نے حکم یعسوف کی شاندار اور وسیع مردانہ وجاہت کے سامنے خود کو نہایت کمترین محسوس کیا اور گھٹنے ٹیک دیے اور ویسے بھی اگر یہ کام میں کرتی تو پھر یہ کہانی کون لکھتا؟ وقت ــــ تاریخ لکھنے والوں کو اندھے عشق سے محروم رکھتا ہے اور یہ محرومی ہی تو تاریخ لکھواتی ہے۔ اُس کی مردانہ لوچ دار آواز، اُس کی گہرا تاثر دیتی لبریز آنکھیں اور چوڑے کندھے کسی بھی عورت کے پاتال میں تسمہ ڈال کے باہر کھینچ لیتے تھے۔

جب میں اور کبالہ کمیون سے باہر نکلیں تو وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ اُس کا بدن بخار میں تپ رہا تھا اور اُس پر کچھ ایسی خماری چھا گئی تھی جیسے بہت کچھ پی کے آئی ہو۔ میں نے اُسے سہارا دیا ہوا تھا۔ خیالات میرے دماغ میں کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ اس سے قبل کہ کوئی سوال میری نوکِ زباں پر آتا دفعتاً اُس نے سوال کر دیا۔ یہ اُس کے سوال یافتہ دور کا پہلا سوال تھا۔

کیا یہ محبت ہے جو میں محسوس کر رہی ہوں؟؟ ہم برلن کے ایک مضافاتی گاؤں کی ایک سرسبز شاداب سڑک کے کنارے ایک ہرے بھرے درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں میں سے کسی میں بھی آگے چلنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ تھکاوٹ یا پھر شدتِ جذبات سے اُس کی ننھی سی ناک سرخ پڑ گئی تھی اور آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔

تم کیا محسوس کر رہی ہو۔ میں نے پوچھا۔

اُس کی آنکھیں، اُس کی بھاری آواز، اُس کا ٹھہرا ہوا جاندار لہجہ، میرا جی چاہا کہ میں پوری کی پوری اُس کے ساتھ لپٹ جاؤں۔ اُس کے اندر سما جاؤں۔ اُس کی آواز میری سماعت کو مطلوب ہے۔ میرا جی چاہا کہ اُس کے حلقوم کے اندر دانت گاڑ کے اُس کی بھاری مردانہ آواز کا سارا رس پی جاؤں ــــ کبالہ کی آواز لرز گئی۔

میرا ذہن اس وحشت انگیز خیال کے ساتھ اتفاق نہ کر سکا۔ حلقوم میں دانت گاڑ کر آواز کا رَس پینے سے اُس کی کیا مراد تھی۔ کیا یہ شدت کی انتہا نہیں۔ میرا حقیقت پسند دماغ اس خیال کی توجیہہ تلاش کرنے سے قاصر تھا۔ ہوسکتا ہے رومانیت زدہ لوگوں کے پاس اس خیال کو سراہنے کی کوئی وجہ ہو مگر میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے اُس کی ظاہری حالت اور لرزتی آواز کو اُس کی صحت کی خرابی پر محمول کیا۔ وہ اُس وقت بخار زدہ تھی اور اُس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میں نے ایک گھوڑا گاڑی کو روکا۔ کبالہ کو اُس پر سوار کرایا۔ خود بھی ساتھ بیٹھی اور ٹاؤن واپس چلی گئیں۔

کچھ دن کے وقفے سے ہم دونوں نے پھر کمیون کا دورہ کیا۔ اِس اُمید کے ساتھ کہ اب وہاں حکم یعسوف کے علاوہ کسی دوسرے ربی کا لیکچر ہوگا۔ مگر اسے خوش قسمتی کہیے یا بدبختی کہ سامنے سٹیج پر وہ اپنی وسیع شخصیت کے ساتھ براجمان تھا۔ اس دفعہ بھی وہ اُسی محویت اور پاگل پن کے ساتھ یعسوف کو گھورتی رہی۔ واپسی پر جب ہم مضافات کی خوبصورت پتھریلی سڑک پر چل رہی تھیں۔ اُس نے ایک نیا سوال تراش لیا۔

کیا میں اس خوبصورت انسان کے بچے کو جنم دے سکتی ہوں؟؟ اُس لمحے اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس کے بدن کو بے جان ہو کر ڈوبتے محسوس کیا۔ اس جذبے کا اظہار شاید اُس کے لیے بے حد بھاری تھا۔ میرا بدن بھی پسینے میں بھیگ گیا۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ ایک مذہبی عالم ہے اُس کے بارے میں ایسا سوچا بھی کیسے جا سکتا ہے؟

بریدہ! سوچو۔ اگر اُس شخص کا خلیہ میرے لہو سے آمیز ہو کر ایک انسان کی تشکیل کرے تو کیسا ہوگا ــــ اُس کی آواز مدھم سرگوشی جیسی تھی۔

سوچو! وہ بھی اتنی شدت اور طلب میں ٹوٹ کر بچہ میرے بدن کے حوالے کرے۔ جتنی شدت اور طلب میں اس وقت محسوس کر رہی ہوں تو اُس بچے کی نفسیات کیسی ہوگی؟ وہ بچہ سیرت و کردار کے کس معراج پر ہوگا؟ میں یہ تجربہ کرنا چاہتی ہوں بریدہ! میرے ہونٹ خشک تھے اور حلق میں

کانٹے اُگ آئے تھے۔ دن ٹھہرا ہوا تھا۔ ماحول میں اُمس تھی۔ وجود کے اندر بھی ایسی ہی گرمی ہو اور باہر بھی ویسا ہی موسم ہو تو اندر باہر کے دونوں موسم آمیز ہو کر عجیب سی ہیجانی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ مجھے لگا کہ میرے نتھنے پھڑک رہے ہیں اور میں سسکاری لینے لگی ہوں۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ کبالہ جو کچھ بھی محسوس کر رہی ہے وہ اُس کے بطون کی کہیں گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ وہ اس معاملے میں بے بس اور لاچار ہو چکی ہے۔ اگر وہ یہ تجربہ کرنا چاہتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ مگر یہ فیصلہ میں نہیں کر سکتی تھی یہ سماج کا فیصلہ تھا اور سماج ایسے تجربوں کے درمیان حائل تھا۔

میں کچھ دنوں سے بے سمتی اور الجھاؤ کی شکار ہوں۔ میرے اندر بھی کچھ سوال ہیں اور یہ سوال میری شناخت اور شخصی آزادی کے ہیں۔ برلن یونیورسٹی میں میرے خلائی پراجیکٹ کا آخری دور چل رہا ہے۔ شعبہ کچھ لوگوں کو آسٹریلیا بھیج رہا ہے ان ممکنہ لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔ مجھے وہاں سیٹلائٹ سے ملنے والی تصویروں کے خصوصی تجزیے کی کلاسز لینی ہیں اور یہ کورس تین ہفتوں کا ہے۔ ہم نے تنہائی کے عوض آزادی کا سودا کیا ہے اور یہ سودا کچھ مہنگا بھی نہیں ہے۔ میں شناخت کا سوال اٹھاتی ہوں۔ میں جرمن ہوں۔ یہ میری شناخت ہے اور یہ شناخت مجھے اس پورے عالمی گاؤں کے اندر معتبر بناتی ہے مگر سوال تو وسائل کی فراہمی کا ہے۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتی کہ کیا کبالہ سیرت و کردار کی انتہا پر پہنچنے والے ایک غیر معمولی بچے کو اس سماج کے لیے جنم دینا چاہتی ہے جو ایک دوسرے سے وسائل چھین لینے کی تگ و دو میں برسرِ پیکار ہے۔

دنیا میں کون سا ایسا معاشرہ ہے جو اخلاقی برتری کی بنیاد پر سپر پاور کہلاتا ہو؟؟ کوئی بھی نہیں۔ بلکہ مہلک اسلحے کی افراط ہی وہ بنیادی شرط ہے جس کی بناء پر سپر پاور کا خطاب ملتا ہے۔ برتری اور کمتری، بلندی اور پستی کے یہ معیارات سرمایے اور موت کے ساتھ جڑے ہیں۔ ایک طرف سرمایہ بڑھتا ہے دوسری طرف حیات گھٹتی ہے۔ جو جسم و جاں کی تگ و دو کرتا ہے اُسے اتنا ہی ملتا ہے جس سے اُس کی روح اُس کے بدن کے ساتھ بنی رہے۔ میں کبالہ کو بھی اُسی تناظر میں دیکھنے لگی تھی۔

وہ اُس شخص کے قرب کے لیے چوبیس گھنٹے اپنے اعصاب کے ساتھ جنگ لڑتی تھی۔ اُس کا لہو اُس کے لمس کے لیے اُبلتا اور پھر ٹھنڈا پڑتا اور اس جان توڑ اعصابی جنگ کے دوران وہ بدحال ہو جاتی۔ اُس کی روح اور اُس کے اعصاب اُس رزق کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے تھے جو کبھی اُس کا نصیب نہ بنا اور دوسری طرف وہی شخص اپنی بیوی کو بہت آسانی اور بغیر کسی محنت کے میسر تھا محض اس لیے کہ وہ اُس کی مالک تھی۔ وہ عورت جو اُس کے حصول کے لیے کوئی روحانی یا جذباتی

تگ و دو بھی نہیں کرتی اُسے وہ حاصل ہے۔ وہ اُسے اپنے بوسے کی حلاوت اور بدن کی حرارت سے فیض یاب کرتا ہے۔ اس کے ساتھ پورے کا پورا ملوث ہے۔ یہ انصاف نہیں تھا۔ کیا کبالہ کی طلب کی شدت اور اعصاب کی شکست و ریخت کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ محض اس لیے کہ وہ مالک نہیں تھی بلکہ اپنی روح کی مزدور تھی۔ کیا ملکیت کے آگے محنت کی کوئی اوقات نہیں؟

مجھے اپنے الجھن بھرے ان سوالوں کے درمیان ہی آسٹریلیا جانا پڑا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میرے بعد کبالہ ایسی حماقت کرے گی کہ تاریخ بھی جس کو کبھی مٹا نہ پائے گی۔

اُنہیں دنوں کبالہ نے عدالت عالیہ سے رجوع کیا۔ مدعا یہ تھا کہ ربی یعسوف کو اُس کے ساتھ ملاپ کی قانونی اجازت دی جائے تاکہ وہ اُس کی اعلانیہ ولدیت کے ساتھ اُس کا بچہ پیدا کر سکے۔ عدالت نے اُس کی اس درخواست کو مبنی بر حماقت قرار دیا اور اُسے سرزنش کی کہ آیندہ وہ حکم یعسوف جیسے کسی معزز ربی کو بدنام کرنے کی سازش نہ کرے اور بہتر ہے کہ کسی نوجوان کے ساتھ شادی کر کے خوش باش عائلی زندگی گزارے۔ ایک باکردار مذہبی عالم کے متعلق ایسے پراگندہ خیال رکھنا ہی اوّل تو جرم ہے اور اگر اُس نے یہ جرم کر ہی لیا تھا تو یوں عدالت میں آ کے اُسے ایک معزز عالم کو بدنام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں جب اپنا پراجیکٹ مکمل کر کے واپس آئی تو کبالہ کی یہ حماقت شہر کا تبصرہ بن چکی تھی۔ میں اگر وہاں ہوتی تو اُسے ایسا کوئی قدم نہ اُٹھانے دیتی۔ مگر اب تیر چل چکا تھا اور اب ہمیں مقدر کا کھیل دیکھنا تھا۔ یہ دن گھٹن اور بے چینی کے تھے۔ کبالہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے مقدمے میں آخر خرابی کیا ہے؟ جس طرح لوگ اپنے باقی حقوق کے لیے عدالتی جنگ لڑتے ہیں اُسی طرح اُس نے بھی محض اپنے حقوق کے لیے ایک فریاد کی ہے اس میں غلطی کیا ہے اور مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کبالہ کے دماغ کے اُس ڈھیلے پرزے تک کیسے پہنچوں جسے کسنے کے بعد اُس کا دماغ ٹھیک ہو سکے۔ انہی حبس زدہ دنوں کے دوران کبالہ کو ایک چٹھی موصول ہوئی۔ یہ چٹھی حکم یعسوف کی طرف سے تھی۔ متن یہاں درج کر رہی ہوں۔

خداوند لم یزل کے برگزیدہ بندے موسیٰ پر سلامتی ہو۔

میں تم سے عمر میں دوگنا بڑا ہوں۔ تم معصوم اور پاکیزہ ہو۔ خدا تمہاری پاکیزگی کو سلامت رکھے۔ مجھے معتوب مت کرو۔ ایک مذہبی انسان کا سب سے بڑا امتحان جنس اور عورت ہے۔ تم نے یا میرے رب نے مجھے اس امتحان میں ڈالا ہے۔ تو نکالے گا بھی وہی۔ وہ مجھے استقامت بخشے۔ میں تمہیں ہم کنار کروں۔ تمہارے اُبلتے لہو کی حدت کو اپنے بدن کی حرارت سے ٹھنڈا کروں میں ایسا

سوچ تو سکتا ہوں مگر کر نہیں سکتا۔ ہم میں سے ہر شخص سماج کے قاعدے قوانین اور اپنے خود ساختہ اُصولوں کا قیدی ہے۔ محرومی صرف تمہیں ہی نہیں مجھے بھی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مگر اس شرف کی سب سے بھاری قیمت وہ اس جنس کے ضمن میں چکاتا ہے اور کوئی قربانی انسان اور اُس کی روح پر اس قدر بھاری نہیں جتنی شہوت کی قربانی بھاری ہے۔ اور یہ قربانی دینے والوں کا درجہ بھی سب سے بلند ہے۔ تم بادشاہ سلیمان کے والد داوٗد نبی کے حالاتِ زندگی ضرور پڑھو۔ خدا تم پر اپنا کرم رکھے۔

احقر العباد

یعسوف

کبالہ نے اس رقعے کو کئی بار پڑھا۔ کبھی طیش اور کبھی ملامت کے ساتھ۔ یہی حال میرا تھا۔ چند لائنوں میں سمٹی اس تحریر کے اندر جہاں کبالہ کے لیے سرزنش تھی وہاں اُس کے لیے ایک اُمید کا پیغام بھی تھا کہ حکم یعسوف اور کچھ نہیں تو کم از کم کبالہ کے لیے ہمدردانہ خیالات ضرور رکھتے ہیں اور اُس کے لیے کچھ سوچتے بھی ہیں اور کبالہ کی وجہ سے اُن کی جو سبکی ہوئی ہے اُس کی طرف بھی انہوں نے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ میرے دل میں اُن کی عظمت کچھ اور بھی پختہ ہو گئی تھی۔

میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ کبالہ کو ساتھ لے کر اُن سے ملنے ضرور جاؤں گی کہ اُنہی دنوں حکم یعسوف کا سانحہ ارتحال ہو گیا۔ آہ۔ وہ کتنا شدید حادثہ تھا کہ شدتِ غم سے پسلیاں ٹوٹنے کو آئیں۔ چھیالیس سال کی عمر کوئی مرنے کی عمر نہیں ہوتی۔ سارے شہر کی توپوں کا رُخ کبالہ کی طرف ہو گیا تھا۔ ہر شخص کا یہی خیال تھا کہ ایک نو عمر جذباتی لڑکی کی احمقانہ محبت نے ایک عالم کی جان لے لی۔ حکم یعسوف کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ یہ سچ تھا یا نہیں مگر اب سچ بن گیا تھا۔ یعسوف کا مرنا اُسی دن لکھا تھا جس دن اُنہیں مرنا تھا مگر موت کا الزام کبالہ پر آنا بھی ممکن ہے تقدیر کا ہی کوئی حصہ ہو۔ اب تک تو میں ان باتوں کو نہیں مانتی تھی مگر اب مجھے بھی لگنے لگا تھا کہ کچھ واقعات کی تشکیل میں انسانوں کا کوئی عمل دخل یا ارادہ نہیں ہوتا۔ وہ محض طے ہو چکے کچھ واقعات کا حصہ بنا دیے جاتے ہیں۔ جیسے کبالہ بن گئی تھی، جیسے حکم یعسوف بن گئے تھے، یا پھر جیسے کوئی اور بھی بننے والا تھا۔

حکم یعسوف نے مرنے سے کچھ عرصہ قبل کبالہ کو جو خط لکھا تھا اُس میں ایک پیغام یا حکم بھی تھا کہ داود نبی کے حالاتِ زندگی کو ضرور پڑھو اور یہی حکم کبالہ کی زندگی میں ایک نیا موڑ لے آیا۔ میں بھی اپنے خلائی مہارت کے طویل اور مہنگے کورس کو یکسر بھلا کر اُس کے ساتھ لگ گئی تھی۔ ہم نے

مقامی لائبریری سے انبیاء کے حالاتِ زندگی کے حوالے سے کچھ کتابیں ڈھونڈ نکالیں اور اُنہیں اپنے نام سے جاری کرا کے ساتھ لے آئیں۔ داؤد نبی کے حالاتِ زندگی میں ایسا کیا تھا کہ جس کی طرف حکم یعسوف نے اشارہ کیا تھا۔ راتیں خنک تھیں مگر ایک شاندار آدمی کی یاد میں غمناک بھی تھیں۔ وہ آدمی جس کا مزار صرف کبالہ ہی نہیں بلکہ میرے دل میں بھی بن گیا تھا۔ ان تاریک خنک راتوں میں ہم نے انبیاء کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ جاری رکھا کبالہ کی آنکھیں پہلے سے بھی بڑی اور روشن ہو گئی تھیں جیسے اُس کے اندر کوئی لائٹ ہاؤس اُگ آیا ہو اور پھر ایک رات مطالعے کے دوران حضرت داؤد کے حالاتِ زندگی پڑھتے ہوئے ایک پیراگراف ہمارے سامنے آ گیا اور یوں اُبھرا گویا ہائی لائٹر سے اُجالا گیا ہو۔ متن یہاں درج کر رہی ہوں۔

''اور پھر ایک شب داؤد نبی بہت بے قرار تھے۔ مشیر خاص نے بے چینی کو بھانپ لیا اور دست بستہ عرض کی کہ کیا حضور کو کسی بیوی یا کسی خاص حرم کی ضرورت ہے؟ مگر پیغمبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ مشیر خاص نے دوبارہ عرض گذاری کہ حضور سبھی بیویاں نہا دھو کر تیار ہیں۔ مگر پیغمبر نے مشیر خاص کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ رات ڈھل رہی تھی اور داؤد نبی دریچے میں کھڑے سامنے شہر کو دیکھ رہے تھے جب اُن کے مشیر خاص اکتی فُل کی پوتی بنتِ صبا غسلِ ضروری کرنے کنیز کے ہمراہ چھت پر آئی اور اس نے لباس الگ کیا اور غسل شروع کیا۔ داؤد نے بنتِ صبا کا نوخیز حسن ملاحظہ کیا اور پھر اُسے اپنے محل میں بلوا کر اپنے وصل سے شاد کام کیا۔ اس پر خدا ناراض ہوا اور جس ہیکل کا خواب داؤد نبی نے دیکھا تھا اس کو اُن کے بیٹے شاہ سلیمان نے مکمل کیا۔''

وہاں خواب ٹوٹنے کی بات تھی مگر یہاں تو زندگی ہی ٹوٹ گئی تھی اور خواب بھی کہاں بچے تھے۔ دکھ کی بات تو یہ تھی کہ کوئی وصل بھی نہیں ہوا، کچھ بھی نہ ہوا اور سب کچھ ہو گیا۔ اُس نے ساری خلق کے طعنے سنے اور ملامت اُٹھائی اور تشنہ کام بھی رہی۔ کیا ہی اچھا ہوتا وہ بھی آدم کی دوسری بیٹیوں کی طرح چور راستہ اپناتی، یہ ذلت تو نہ سہنی پڑتی، یہ محرومی کا دکھ تو نہ ہوتا۔ آہ کتنی عظیم، کتنی ارفع، کتنی شاندار تھی وہ اور کتنی معتوب ہو گئی۔ اُس کی لاحاصل محبت، اُس کا ضبط، اُس کی تشنہ کامی اور پھر اُس پر ہونے والی ملامت کی میں گواہ ہوں۔ کیا اتنے بڑے امتحان سے گزرنے والے آدمی کی اصل شناخت کے لیے ایک گواہ کا ہونا کافی ہے؟ وہ ساری رات رویا کرتی۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ اُس کی روح بڑے سمندر میں ڈھل گئی ہے جو ہر وقت بہتا رہتا ہے۔ وہ قطار اندر قطار آنسو بہاتی۔ اس آنسو بہانے میں بھی ایک لذت ہے۔ مجھے اس لذت کا تجربہ نہیں مگر میں نے اسے کبالہ کے بدن سے پھوٹتے

دیکھا تھا۔ ہم ساتھ رہا کرتیں وہ رات کو سوتے وقت میری طرف پیٹھ پھیر لیتی اور پھر اُس کا بدن ہولے ہولے لرزنے لگتا۔ چند لمحوں کی محبت، جس میں لمس کو پانے کی خواہش، وسیع سینے میں سما جانے کی آرزو اور جانے کیا کیا تھا۔

کیا حرج تھا اگر اس لرزتے بدن کو اُس خاک ہو چکے جسم سے کچھ تھوڑا سا اثاثہ مل جاتا؟ کیا تھا جو اس مضطرب روح کو اُس گمشدہ روح کی کچھ پرچھائیں مل جاتی؟؟؟ اتنی شدید طلب القاء کر کے فاصلے اتنے زیادہ کیوں بڑھا دیے گئے؟؟؟

آخر اس سے کیا مقصود تھا؟

کبالہ کی برداشت کا درجہ بڑھتا جا رہا تھا اور میرا گھٹتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہ وہم لاحق ہو گیا تھا کہ برداشت کا درجہ بڑھنے سے آزمائش کے سلسلے دراز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ دن کو خاموش اور پُرسکون رہتی تھی اور رات کو متلاطم، یہ کیفیت اُس پر ٹھہر گئی تھی۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے میں نے اُس کے ساتھ جا کر فلم دیکھنے کا ارادہ کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تقدیر ایک بار پھر اُس کی گھات میں ہے۔ اتفاق سے یہ فلم شاہ سلیمان کے حالات زندگی پر مبنی تھی اور اس فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا ''معارب''

معارب شکل سے یہودی لگتا تھا، نظریاتی حوالے سے ملحد اور جنسی لحاظ سے عرب۔ وہی لوچ دار مردانہ آواز، گہرا تاثر دیتی لبریز آنکھیں اور چوڑے کندھے، اس کو کوئی مذہبی خطبہ سننے سے زیادہ کوئی بھی اچھا سا کھانا پیٹ بھر کر کھانے سے دلچسپی تھی۔ وہ بہت سلیقے اور نزاکت سے کھاتا، اور یہ نفاست اُس کے قدرتی مزاج کا حصہ نہ تھی بلکہ اُسے اُس کے پیشے نے سکھائی تھی۔ تصنع اور بناوٹ، ہر معاملے میں اور ہر شخص کے سامنے بنے رہو اور تہذیب کا مظاہرہ کرو۔ کون جانے یہ لوگ اپنی تنہائیوں میں کیا اور کیسے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم جیسے عام لوگ تو انہیں صرف پردہ سکرین پر ہی دیکھتے ہیں۔

وہی اونچا قد، گہرا تاثر دیتی لبریز آنکھیں اور چوڑے کندھے، یہ غلطی تھی یا تقدیر کا ٹکراؤ، میں پھر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ہم ہال کے اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ وہ تب بھی پُرسکون اور خاموش دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ذہن دو طرف بٹ گیا۔ دماغ کی ایک رو میرے اپنے اُس ہاتھ کی طرف تھی جس کے اوپر کبالہ کا ہاتھ رکھا تھا اور دوسری رو سکرین پر تھی۔ تقدیر کے اس کھیل کا تیسرا کونا ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ اچانک کبالہ کا ہاتھ لرزا۔ شاہ سلیمان سامنے کھڑے تھے۔ وجاہت،

تمکنت، وقار اور طنطنے کا پیکرِ اعظم، ہاتھ میں تلوار لیے جنات کو تہہ تیغ کرتے سالارِ اعظم۔

عقلِ غیاب جستجو، عشق حضور و اضطراب

فلم کے اختتام سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

کارڈیالوجی کیئر یونٹ میں بے ہوش پڑی کبالہ کی زبان پر ایک ہی جملہ رواں تھا ''مجھے شاہ سلیمان سے ملنا ہے۔''

معارب کے متعلق معلومات لینے میں مجھے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ترکی میں پیدا ہوا اور وہاں کے نائٹ کلبوں کی ایک مشہور چین کے مالک کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی ماں جرمن تھی۔ ترکی اور جرمنی اُس کے مشترکہ ٹھکانے تھے۔ معارب کو ڈھونڈنے اور رابطہ کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس سے آگے کی کہانی ''معارب'' کی زبانی سنیے۔

مجھے میرے اسسٹنٹ نے برلن سے آنے والے ایک پیغام کی بابت بتایا جو بار بار آ رہا تھا کہ وہاں کے معروف کارڈیالوجی سنٹر میں زیرِ علاج ایک مریضہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ یہ پیغام ہسپتال کی انتظامیہ اور وہاں کے ایک معروف سماجی ادارے کی طرف سے آ رہا تھا جو ایس۔او۔ایس کے ساتھ کام کرتا ہے۔ میں اس طرح کے پیغامات کا عادی ہوں۔ ہماری زندگیوں میں اس طرح کے واقعات چلتے رہتے ہیں۔ اس لیے زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر اس پیغام میں کچھ الگ تھا اور دوسری بات یہ کہ اس سنجیدہ نوعیت کے پیغام کو دو حساس ادارے نشر کر رہے تھے۔ لہٰذا میں نے اپنی مصروفیت میں سے اس کام کے لیے ایک دن مختص کیا اور پیغام بھجوا دیا کہ میں فرینکفرٹ میں اپنے پرائیویٹ گھر کے اندر ایک دن کے لیے فارغ ہوں اور اُس مریضہ سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔ اچھا کھانا اور حسین عورتیں میرا شوق تھیں مگر اب نہیں ہیں۔ یہ تبدیلی مجھ میں اُس مریضہ سے ملنے کے بعد آئی ہے۔

میں بے دلی کے ساتھ اُس کا منتظر تھا جیسے یہ بھی کوئی روزمرہ کا کام ہو اور اسے ختم کرنے کے بعد ذاتی تفریح کے لیے کہیں جانا ہو۔ ابھی میں اسی کیفیت میں تھا کہ اسسٹنٹ نے مجھے اُس کے آنے کی اطلاع دی۔ میں کمرہ ملاقات کی طرف بڑھا۔ یہ ملاقات خفیہ تھی مگر اُس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ہسپتال انتظامیہ، سماجی ادارے یا اُس کے خاندان کے لوگ سبھی کے چہروں پہ سنجیدگی اور حیرت تھی۔

میں نے اُسے دیکھا، وہ دراز قد، شہد رنگ بالوں اور کشادہ روشن آنکھوں والی حسین لڑکی

تھی۔ اُس کے بدن پر سیاہ لبادہ تھا مگر اُس کے کندھے عریاں تھے۔ اُس نے سر کو ہلکے آسمانی رنگ کے اسکارف سے ڈھک رکھا تھا۔ مگر اسکارف کے نیچے سے گھنے لمبے بالوں کا آبشار بہہ کر دور نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی تھی اور ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم دیوار کی طرف مڑ گئی۔ گھنے لمبے شہد رنگ بالوں کا آبشار اب میری نظروں کے سامنے تھا کہ وہ چیخ پڑی۔

نہیں۔نہیں۔ یہ وہ نہیں ہیں یہ وہ نہیں ہیں۔ وہ انہیں الفاظ کو دوہرا رہی تھی۔ کمرے میں موجود سب لوگ حیرت زدہ تھے کہ اُسے اچانک ہوا کیا تھا۔ سب حیران تھے کہ دفعتاً اُس کی دوست جو اُس کی محرم راز بھی تھی میرے قریب آئی اور مجھے کسی دوسرے کمرے میں جانے کی درخواست کی۔ میں معذرت خواہ ہوں سر! کیا آپ اُس کی زندگی کی خاطر ایک بار بادشاہ سلیمان کے گیٹ اپ میں اُس کے سامنے آئیں گے؟ میں حیران رہ گیا۔ اچھا تو یہ بات تھی۔ وہ معارب سے نہیں شاہ سلیمان سے ملنا چاہتی ہے۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے ہاں کہہ دی۔ فلم کے پروڈیوسر سے رابطہ کرنے کا سٹیوم منگوانے اور تیار ہونے میں خاصا وقت لگا مگر یہ میری زندگی کا سب سے انوکھا اور اچھوتا تجربہ تھا۔ آج میں لاکھوں، کروڑوں ناظرین کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک، صرف اور صرف ایک ہستی کی خاطر تیار ہو رہا تھا۔ یہ چیز اور یہ احساس میرے اندر عجیب طلاطم پیدا کر رہے تھے۔ میں نے اپنی روح کے اندر ایسی سرشاری اور کھلبلی اس سے قبل کسی بھی فلم کے سین کے لیے تیار ہوتے وقت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ مگر آج کچھ خاص تھا۔ پیسے یا شہرت کی خاطر نہیں بلکہ ایک زندگی کی خاطر، کروڑوں لوگوں کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک لڑکی کی خاطر۔ آہ۔ میں کیسے بیان کروں؟ جیسے میں ایک دولہا ہوں اور دولہن بیاہنے جا رہا ہوں اور پھر میں شاہ سلیمان کے گیٹ اپ میں تیار تھا۔

میں نے قدم اُس کمرے کی طرف بڑھائے جس کے اندر وہ تھی تو مجھے لگا کہ میرا دل اُچھل کر بدن سے باہر آ جائے گا۔ تیز شور مچاتی دھک دھک سے بچنے کے لیے میں نے قدم مضبوطی سے جما لیے اور پھر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی عامل کے معمول کی طرح اٹھی۔ بہت آہستہ سے چلتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ اُس کا روئی کے گالے ایسا نرم و نازک بدن میری بانہوں میں تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں اور سانسوں سے میری گردن، رخساروں اور سینے کے بوسے لے رہی تھی۔ یکدم میں نے اُس کے بدن کو ڈھیلا پڑتے محسوس کیا۔ میرے دل کی دھڑکن بے حد تیز ہو گئی تھی۔ تاب نہ لا کر میں نے ایک جھٹکے سے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر خود سے الگ کیا۔ میں اُس کے ایمان شکن ہونٹوں کا بوسہ لینا

چاہتا تھا۔

جونہی میرے ہونٹ اُس کی ناک کے قریب گئے مجھے لگا کہ اُس کی سانس رک گئی ہے۔

آہ۔ بوسہ ادھورا ہی رہا۔ وہ جا چکی تھی۔ وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

اچھا کھانا اور حسین عورتیں میرا شوق تھیں مگر اب نہیں ہیں۔

میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ مجھ پر ''کبالہ'' کا اثر ہے۔ (یاد رہے کہ یہودی مذہب میں کبالہ ایک کالے جادو کا نام ہے) میرا یہ دوست میری زندگی میں در آنے والے اس حادثے سے واقف نہیں۔ میں اُسے بتانا بھی نہیں چاہتا کہ وہ ایک ادھورا بوسہ ہی دراصل میری اب تک کی ساری زندگی کی ذاتی شے ہے۔ ورنہ تو کتنے ہی بوسے ہیں جنہیں کروڑوں ناظرین دیکھ چکے ہیں۔ وہ تو صرف اپنی کہتا ہے اور میں اُس کی بات کو سچ مانتا ہوں کہ وہ بھی جھوٹ نہیں بولتا۔

وہ نہیں جانتا کہ اُس کا نام بھی ''کبالہ'' تھا۔

اور میں ایک ادھورے بوسے کے لامختتم دائرے میں ٹھہر گیا ہوں۔

''کبالہ'' بھی تو یہی ہے۔ ایک لامختتم دائرے کا پُرسکون ٹھہراؤ۔

دم کشی

کچھ عرصے سے اس بستی کے لوگوں نے ایک عجیب ریت پکڑی تھی۔ جیسے ہی عصر کی نماز کے بعد شام کا جھٹپٹا پھیلتا بستی کے سبھی مرد و زن، پیر و طفل چھت کی طرف بھاگتے۔ اُن کی نگاہیں مشرق کی طرف گڑی ہوتیں اور دل بے قرار ہوتے اور یہ بے قراری سبقت لے جانے کی ہوتی تھی اور جب تک سورج کے مکمل اوجھل ہونے کے بعد اندھیرا نہ پھیل جاتا، بستی کے لوگ ــــ نیچے نہ اُترتے۔ ٹھیک اس وقت سے پینتیس سال قبل اُس نے یہی کیا تھا۔

''مشرق کی جنوبی سمت سے غروب آفتاب کے فوراً بعد ایک ستارہ نمودار ہو گا۔''

رانگلے ٹِبّے کے پہلو میں آباد اپنے مکینوں کی نیتوں اور اعمال کی طرح ٹیڑھی میڑھی، آڑھی ترچھی اور اوبڑ کھابڑ پگڈنڈیوں والی یہ آبادی اپنی سمت آنے والے کے دماغ میں بھنور ڈال دیتی تھی۔ اس آبادی تک جانے کے لیے مسافر کو اتنے موڑ، گولائیاں اور ٹیڑھیں پھاندنی پڑتیں کہ اس کا حشر ہو جاتا۔ جانے اس بستی کے آبادکار نے اس تک جانے والے راستوں کو اتنا دقیق کیوں بنایا تھا۔ ''مروان شاہ مراد'' نامی اس بستی کے اوپر ہمہ وقت ایک ملگجا اندھیرا چھایا رہتا جو شاید کچے راستوں سے اٹھنے والی دھول کا تھا۔ بستی کو جانے والے پُراسرار راستوں میں محض ایک چند ایکڑ کی پٹی ایسی تھی جو ہموار کہی جا سکتی تھی، جس کے اوپر کہیں کہیں جمے تارکول اور بجری کے کھرنڈ اس بات کا ثبوت ــــ فراہم کرتے تھے کہ یہاں کبھی پکی سڑک رہی ہو گی۔ اس سڑک کے پہلو میں مردہ سانپ کی طرح سیدھی لیٹی ہوئی ایک پانی کی کھال تھی۔ جس کے سڑک والے کنارے پر بانس کے گھنے پودے لگے ہوئے تھے۔

اس رانگلے ٹبے سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر اُس کا ڈیرہ تھا۔ دیہاتوں کی شامیں ایک جیسی ہوتی ہیں ماسوائے سردیوں کی شام کے، ہاں سردیوں کی شام قدرے الگ ہوتی ہے کیونکہ رات جلدی اُتر آتی ہے۔ ایسی ہی ایک تیزی سے اترتی ہوئی رات کو وہ قصبے سے سوداسلف لے کر گھر پہنچا تو ایک مہمان کو حقے کی نڑی تھامے بیٹھک کے سامنے بیٹھے پایا۔ سودے کا تھیلا گھر والی کو پکڑا کر اس نے بھیڑ کی اُون سے بُنی گرم چادر کی بکل دوبارہ سے بٹھائی اور باہر کی طرف ہولیا۔ مہمان کچھ دور کے گاؤں میں بیاہی اس کی بہن کا سسرالی رشتہ دار تھا۔

روٹی پانی کے بعد اس نے ڈھور ڈنگر باڑے کی طرف ہانکے۔ گرم سَتھ کے اندر بھینسوں کو باندھنے کے بعد ٹاٹ کا پردہ گرایا۔ پچھالی کے کماد کے کھیت سے ٹٹول کے دو تین اچھے ٹانڈے توڑے اور بیٹھک کے اندر مہمان کے پاس آ بیٹھا۔ حقہ ابھی تازہ تھا، تمبا کو اور دہکتے انگاروں کی ملی جلی باس عجیب سا نشاط انگیز تاثر بکھیر رہی تھی۔

باتوں باتوں میں اس نے پوچھ لیا کہ اس کی آمد کا مقصد کیا ہے؟

''مروان شاہ مراد'' کے سید مطلوب شاہ اپنی قبر سے زندہ ہو کر باہر نکل رہے ہیں۔''

اوہ ایک جھٹکے نے اس کے ہونٹ گول اور باچھیں ٹیڑھی کر دیں۔ ''ڈھونگی'' لفظ اس کے اندر سے اُبلتا اُبلتا رہ گیا مگر وہ لفظ کو پی گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سیّد مطلوب شاہ کی بڑی منتا ہے اور ایسی ویسی بات کرنا مہمان کا دل دکھانے کے مترادف ہے۔ سو لفظ کو اس نے اپنے اندر ہی کہیں دبا لیا۔

''کتنے عرصے بعد____؟

اس نے حقے کا کش لگاتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

''پینتیس سال بعد____''

مہمان کا لہجہ عقیدت اور انکسار کی شیرینی سے بھر گیا۔

''عجیب بات ہے تم جو مروان شاہ مراد کی بغل میں بیٹھے ہو اتنے بے خبر ہو۔

اُدھر دور دور تک سیّد مطلوب شاہ کے شہرے ہیں۔''

مہمان نے حیرت کا اظہار کیا۔

''میں ایسی باتوں میں نہیں پڑتا۔''

اس نے مختصر بات کی اور بے نیازی سے آنکھیں میچ لیں سیّد مطلوب شاہ اپنی قبر سے زندہ

ہو کے باہر نکل رہا ہے۔

''سیّد مطلوب شاہ اپنی قبر سے زندہ ہو کے باہر نکلنے والا ہے۔''

''سیّد مطلوب شاہ اپنی قبر سے زندہ ہو کے دوبارہ باہر نکلنے والا ہے۔''

ماضی، حال، مستقبل کے تینوں زمانوں پر مبنی یہ جملے ان دنوں بچے بچے کی زبان پر تھے۔ ہر طرف ایک ہی قصہ تھا۔ سیّد مطلوب شاہ جو پینتیس سال قبل خود بہ خود قبر کے اندر اُتر گیا تھا۔ اب زندہ ہو کر باہر آ رہا تھا۔ سنا ہے تب اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھا گیا تھا۔ واللہ اعظم رب نو معلم، مروان شاہ مراد کی بستی کی ساری آبادی سرِ شام اپنے کام کاج اور بکھیڑے چھوڑ کر گھروں کی چھتوں پر کھڑی ہو جاتی۔ عورتوں کی چولہوں پر چڑھائی ہانڈیاں جل جاتیں یا دھواں پڑ جاتا اور مردوں کے ڈھور ڈنگر چیختے، چلاتے، بکاتے ڈکراتے رہتے مگر وہ تب ہی نیچے اترتے جب رات کی سیاہی اپنی چادر پھیلا دیتی۔ مشرق کی جنوبی سمت ان لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہوتی تھی۔ جدھر سے اس ستارے کو نکلنا تھا اور جس کے نکلتے ہی سیّد مطلوب شاہ کو اپنی قبر سے طلوع ہونا تھا۔ بستی کا ہر بچہ اور ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ سب سے پہلے وہ اس مقدس اور معتبر ستارے کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرے جو سیّد مطلوب شاہ کی حیات بعد الموت کا ضامن تھا۔

کہ انہی دنوں ایک حادثہ پیش آ گیا۔

مہمان اگلی صبح ناشتے کے بعد ہی مروان شاہ مراد کی طرف روانہ ہو گیا تو ڈیرے دار نے اپنے کاموں کی طرف جھاتی ڈالی۔ دن گزرا رات آئی اور اگلی صبح بھی طلوع ہو گئی مگر لہو لہو۔ اس کے ڈیرے سے اوپر مغرب کی سمت پکی سڑک گزرتی تھی جہاں ایک ڈمپر نے ٹکر مار کر ایک موٹر سائیکل سوار کی زندگی ختم کر دی اور خود فرار ہو گیا۔ خبر ملتے ہی وہ کھیتوں کو الاہنگتا اور پھلانگتا پکی سڑک پر پہنچ گیا۔ مرنے والے کی لاش برلب سڑک تھی۔ کسی نے سفید سوتی کھیس لا کر میت پر ڈال دیا تھا۔ مرنے والے کا لہو ابھی تک تازہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میت کے منہ سے کھیس ہٹایا، مرنے والا کوئی اور نہیں مروان شاہ مراد کا رہائشی اور سیّد مطلوب شاہ کا بھتیجا تھا۔ جس کی عمر اس وقت پچاس سال تھی۔

35+15=50

اس نے وہیں کھڑے کھڑے چہرہ مروان شاہ مراد کی طرف موڑا۔ سیّد مقصود شاہ کی عمر کا حساب کتاب لگایا اور پھر سماعت کو یکجا کر کے رنگلے ٹبے کے پہلو میں کھڑے مروان شاہ مراد کے اندر بجتے ڈھولوں کی آواز سننے کی کوشش کی۔ آواز اس کی سماعت کی گرفت میں آ گئی۔ ڈھول اور نوبتیں بج

رہی تھیں۔ لنگر خانہ کھلا تھا۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیاں آباد تھیں۔ دیگیں کھڑک رہی تھیں۔ شور شرابا تھا، ماحول اسرار میں گھلا ہوا تھا کہ یک دم سارا کچھ سرد پڑ گیا جب سیّد مقصود شاہ سرخ کفن پہنے درگاہ کے صحن میں آن براجا اور پھر وہ شام جس شام کو ستارہ طلوع ہونا تھا اور سید مطلوب شاہ کو زندہ ہو کر قبر سے باہر آنا تھا اور وہ واقعہ ہونا تھا جو اس سے قبل شاید اس صدی کے لوگوں نے ہوتے نہیں دیکھا تھا نہ ہو پایا۔

کوئی آنکھ ستارے کے استقبال کو نہ اُٹھی کہ سبھی آنکھیں تو اس شام سیّد مطلوب شاہ کے مزار سے باہر درگاہ کے احاطے میں سرخا سرخ پڑے سیّد مقصود شاہ کے ساکت بدن کے ساتھ لپٹی تھیں۔

جنازہ رات کو تھا۔ وہ بھی جنازے میں جا کے شامل ہوا۔ جنازہ ٹھیک سیّد مطلوب شاہ کی قبر کے رخ پر لٹایا گیا تھا۔ کیا یہ ایک شخص کا جنازہ تھا؟ یا ایک شخص کی آڑ میں دوسرے کا تھا؟

مگر سنا ہے کہ جب سیّد مطلوب شاہ مرا تھا تو اس کا جنازہ نہیں ہوا تھا۔ نہ پھوہڑی نہ فاتحہ، کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا وہ خود بہ خود قبر کے اندر چلا گیا تھا اور اب پینتیس سال بعد اسے باہر آنے کی سوجھ رہی تھی اس کا پچاس سال کا بھتیجا وقت مقرر سے صرف ایک پہر پہلے جاں بحق ہو گیا۔ مقصود شاہ کی تدفین کی اگلی شام مروان شاہ مراد کے لوگ ایک بار پھر گھروں کی چھتوں پر تھے۔ ستارہ نکل آنا چاہیے تھا مگر ستارہ ابھی تک ناپید تھا۔ ولولے مایوسیوں میں ڈھلنے لگے تھے۔

ایک وہ تھا جو جانتا تھا کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ اس کی زندگی مقصود شاہ کی زندگی کے ساتھ جڑی تھی اور اب مقصود شاہ کی موت کا مطلب تھا مطلوب شاہ کی موت ـــــ بات تو محض ہاتھ کی ایک معمولی جنبش کی تھی مگر تقدیر مطلوب شاہ کے ساتھ کھلواڑ کر گئی۔

مقصود شاہ کی موت کے ساتویں دن کالا لمبا چوغہ پہنے اور سر پہ سفید شملہ رکھے ایک عجیب و غریب شخص درگاہ میں آن براجا۔ سرخ آنکھیں سرتاپا جلال ہی جلال کہ لوگوں کے ماتھوں پر حیرتوں کی لکیریں کھچی رہ گئیں اور لبوں کے سوال وہیں سُوکھ گئے۔ مہمان پراڈو سے اُترا اور نہایت تمکنت سے قدم دھرتا خود بہ خود اندر کے ایک حجرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا۔ ان دونوں کی آمد کے پندرہ منٹ بعد وہی پراڈو اس کے ڈیرے پہ آ کے رُکی تب وہ بھینسوں کا دودھ دوھ رہا تھا۔ جلدی سے اٹھا ہاتھ منہ دھو کر لباس بدلا اور پراڈو میں بیٹھ گیا۔ اونچے شملے والے نے اٹھ کر استقبال کیا۔ پیچ در پیچ بنے اس حجرے کے اندر بیٹھے تیسرے آدمی پر اس کی نظر پڑی تو اسے پہچاننے

میں دیر نہ لگی۔ بلاشبہ وہ سلامت مستری تھا۔

"سلامت مستری جس نے مطلوب شاہ کی قبر تعمیر کی تھی۔"

سلامت مستری، اونچے شملے والا اور "وہ" ان تینوں کی مثلث ہی اب روئے زمین پر ایسی تھی جو سیّد مطلوب شاہ کے مرگ و حیات کے اس راز سے واقف تھی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے تھے۔ خاموشی کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اب انھی تینوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ اب باقاعدہ مر چکے مطلوب شاہ کا باقاعدہ جنازہ پڑھ کے اسے باقاعدہ دفنایا کیسے جائے۔

"پاکھنڈی کہیں کا ڈھونگ باز۔"

اونچے شملے والے نے گہرا سانس کھینچا۔

خاموشی کے دیئے اٹھائے وہ تینوں آگے پیچھے مطلوب شاہ کے تہہ خانے کی سیڑھیاں اُترے جو عوام الناس کی نظروں میں قبر تھی۔ کیونکہ اسے قبر ہی مشہور کیا گیا تھا۔ شام کے سمے دیا اٹھائے سلامت مستری آگے تھا۔ اب پہلا، تب آخری ـــــ

ہاں کیوں کہ تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے واپس ہٹنے والا وہ آخری آدمی تھا اور اب اسی دروازے کو کھولنے والا پہلا آدمی بھی اسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ تہہ خانے سے باہر اب بھی لوگ گھروں کی چھتوں پہ کھڑے مشرق کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ستارہ دیکھنے کے لیے، اس بات سے بے خبر کہ تارہ تو طلوع ہو کے غروب بھی ہو چکا تھا۔

سلامت نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ بند کرتے سمے جن بازوؤں کے پٹھے پلاسٹک کے رسے کی طرح گتھم گتھا کسے ہوئے تھے مگر اب کھولتے سمے اُنہی پٹھوں کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ دروازہ کھلا تو تینوں ایک دم پیچھے کی طرف ہٹے۔ پینتیس سال سے بند زندہ انسانی جسم کی موجودگی نے نہ جانے کون کون سی گیسوں کو جنم دیا تھا۔

اور پھر سید مطلوب شاہ ان کے سامنے تھا
چارپائی پہ دم سادھے چت لیٹا ہوا
زندہ یا مردہ ـــــ بعید از قیاس
پاکھنڈی، ڈرامے باز

"اس ڈھونگی نے پہلی بار پانچ دن کی دَم کشی کی۔ اونچی شملے والے کی آواز

اُبھری۔ میں اس سے عمر میں چھوٹا ہوں مگر ہم دونوں مل کر ایک ہندو گیانی سے سیکھ رہے تھے جو چالیس چالیس دن تک سانس روکے قبر میں پڑا رہتا تھا اور پھر باہر نکل آتا اور عقیدتیں اور پیسے بٹورتا۔ اس مشق کے گیانیوں اور سادھوؤں کا ایک خاص نظریہ ہے کہ انسان گنے ہوئے سانس لے کر دنیا میں آیا ہے۔ جب تک اس کے سانسوں کی گنتی ختم نہیں ہوتی تب تک وہ زندہ رہتا ہے۔ جب یہ گنتی ختم ہوتی ہے، یعنی سانسوں کی پونجی خرچ ہو جاتی ہے تو بندہ مر جاتا ہے۔ اس نظریے کو بنیاد بنا کر زمین پر طویل عرصے تک جینے کے لیے ان لوگوں نے ''دم کشی'' کی ریاضت شروع کی اور کئی کئی سال دم سادھے پڑے رہتے اور پھر ایک دن اچانک جاگ جاتے۔ یہ دم کشی اوقات اور ساعتوں کے حساب کتاب کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخصوص ساعت میں آغاز اور اختتام کا زائچہ بنا کر ایک لکیر ادھوری چھوڑ دی جاتی ہے۔ جب اختتام کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو وہ لکیر برابر کر دی جاتی ہے اور دَم کش جاگ جاتا ہے۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ہم دونوں سیکھ رہے تھے کہ اس نے پانچ دن کی دم کشی کی۔ پانچویں دن ساعتوں کے اختتام پر زائچے کی لکیر کو ملانے والا میں تھا۔ جیسے ہی میں نے لکیر ملائی اس نے آنکھیں کھول دیں۔

دوسری بار کی ''دم کشی'' اس نے میرے ابا کی بیٹھک میں کی۔ یہ اور ابا لنگوٹیے یار اور ہم راز تھے۔ یہ دم کشی ایک مہینے کی تھی۔ ڈیرے والے نے بات شروع کی۔ میں تب چھوٹا ہی تھا۔ یہ ابا کی بیٹھک میں آیا کرتا تھا۔ مطلوب شاہ کے پاس نہ جانے کون سی گیدڑ سنگھی تھی کہ ایک لمحے میں لوگوں کو رام کر لیتا۔ دم کشی تو بعد میں اس نے سیکھی۔ علم جفر، رمل، علم الاعداد، علم نجوم، نہ جانے کون کون سے علوم اس کی پٹاری میں تھے کہ لوگ بیعت ہونے لگے اور یہ کرنے لگ گیا۔ ہاں تو اس دفعہ اس نے مریدوں اور عوام الناس پہ دھاک جمانے کے لیے دم کشی شروع کی۔ زمین پہ زائچہ بنایا۔ ایک لکیر کو ادھورا چھوڑا۔ ابا کو نصیحتیں کیں کہ کب کس ساعت کو کس سے اس نے اس لکیر کو دوسری سے ملانا ہے اور چت دم سادھے لیٹ گیا اور ابا نے اس

زائچے کے اوپر طغاری الٹا کر رکھ دی۔ پورے ایک مہینے بعد ابا نے انہی ساعتوں میں طغاری اٹھائی اور زائچے کی لکیر ملا دی۔ مطلوب شاہ نے زن سے آنکھیں کھول دیں۔

اور تیسری مرتبہ نوٹنکی کو اکٹھے پینتیس سال کی سوجھی۔''

تینوں خاموش ہو گئے انسان ان زمانوں میں کیسے سانس لے سکتا ہے۔ جو اس کے نصیب میں ہی نہیں۔ زائچہ کھینچ کے اب کی بار بہت چھان پھٹک کر اس نے سید مقصود شاہ کا انتخاب کیا تھا کہ وہ اس زائچے کی ادھوری لکیر کو ملائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ

''پندرہ سال کا لڑکا پینتیس سال بعد بھی پچاس سال کی عمر میں ہٹا کٹا زندہ سلامت رہے گا۔''

اپنی طرف سے اس کے انتظامات بڑے پکے تھے۔ مگر تقدیر مطلوب شاہ کے ساتھ کھلواڑ کر گئی۔

مطلوب شاہ جہاں، جیسا اور جس حالت میں تھا۔ ویسا ہی رکھنے کا فیصلہ کر کے تینوں باہر نکل آئے اور کرتے بھی کیا کہ زائچہ کی لکیر تو شاید وہ ملا سکتے تھے مگر گزر گئے سمے کو واپس موڑنا کسی کے بھی اختیار میں نہ تھا۔ اب اس کو تہہ خانے سے نکالتے تو جانے کیا کیا دنگے ہوتے کہ اتنے سالوں میں اس کے مریدین باصفا کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی تھی۔ ہر زبان پر اس کی کرامتوں کے چرچے تھے۔ اس کی موت کا اعلان ـــــ حیات بعد الموت اور پھر موت بعد الحیات کے بکھیڑوں کو وہ کیا سمجھتے؟؟؟؟ کہ اتنی عقل بھی جس میں ہو وہ متابعت ہی کیوں کرے۔ اپنی عقل کی پیروی کیوں نہ کر لے؟

جنازہ بھی ہوا تو کب؟؟؟

پینتیس سال بعد ـــــ

اور اس صدی کے لوگ پہلی بار اس طرح کا حیرت انگیز جنازہ پڑھ رہے تھے۔

تاریخ کا جنم

سنو! آج کیا تاریخ ہے؟ میں نے جھکی ہوئی کمر اور سفید بالوں والے بوڑھے سے آخری بار التجا کی ـــــ تاریخ ـــــ تاریخ کا لفظ سنتے ہی اس نے دوسری طرف دوڑ لگا دی۔شہر کے چوراہے میں کھڑی کھڑی میں عاجز آ گئی۔کوئی بھی تاریخ نہیں جانتا تھا یا پھر تاریخ بتانے کو تیار نہیں تھا۔یا تاریخ سے خوفزدہ تھا۔پھر میں نے ساگ کی گندلیں بیچنے والی بوڑھی عورت کو سنا،وہ کہہ رہی تھی۔''وہ پھر سے حاملہ ہے۔''

میں چونکی۔ یہ بوڑھی ساٹھ سال کی ہے یہ کس طرح حاملہ ہوسکتی ہے؟؟؟ میری حیرت کو اس نے سن لیا اور اپنے پوپلے منہ کو میرے کان کے قریب لے آئی اور سرگوشی میں بولی ـــــ ''میں تاریخ کی بات کر رہی ہوں۔تاریخ پھر سے حاملہ ہے'' کیا تم نہیں جانتیں؟؟؟''

اب کی بار اس کی کوکھ میں کیا ہے؟ میں نے ایک پر تجسس سرگوشی کی،اس پر وہ برہم ہوگئی اور ساگ کی گندلیں اٹھا کر چل پڑی۔

تاریخ پھر کچھ جنم دینے والی تھی۔شہر کے لوگ خوفزدہ تھے۔خوف تمام شہر کے درودیوار پر اگ آیا تھا۔کسی کو بھی تاریخ یاد نہ تھی مگر سب کے ذہن وحواس پہ چھائی ہوئی تھی ـــــ

میں نے خود کو ٹٹولا ـــــ میں ہر طرح سے سلامت تھی ـــــ گویا تاریخ سے لاعلمی پر میرا کچھ نہیں بگڑا تھا۔سب کچھ ویسے کا ویسا تھا کہ پھر اچانک شہر پر اندھیرا چھا گیا ـــــ بینائی کو اندھیرے نے دبوچ لیا۔لوگ اندھیرے میں دبک گئے تھے۔ایک سناٹا تھا ـــــ میں نے اپنے ہاتھوں کو جنبش دی اور اندھیرے کے سیاہ قرطاس پر کچھ رقم کرنے کی کوشش کی مگر بے سود ـــــ

رقم تو تاریخ کرنے والی تھی ـــــ

تاریخ گم ہو جائے تو کیا ہوتا ہے؟

کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ

کیا یہاں کوئی تخریب ہونے والی ہے؟ میرے دماغ کے ایک حصے نے سوال کیا؟

ہاں تخریب ہونے والی ہے ـــــ تخریب بہت ضروری ہے ـــــ دوسرے حصے نے جواب دیا۔میں نے دماغ کے دوسرے حصے کا منہ نوچ لینا چاہا مگر اندھیرا آڑے آ گیا۔تم دہشت گرد ہو،تخریب کار ہو،تم پر لعنت ہونی چاہیے۔دماغ کا پہلا حصہ پھنکارا ـــــ

نہیں تو،تخریب ضروری ہے۔تعمیر کے لیے ضروری ہے ـــــ دوسرا آرام سے بولا ـــــ

دیکھو! درخت کو کاٹو گے،کاٹنے کے بعد چیر کر اس کے پکھر اور بالے نہیں نکالو گے تو چھت کیسے جڑے گی؟ مٹی کو کھود کے،گوت کر اس کو سانچے میں ڈال کے پھر بھٹے کے اندر پکا کر اینٹ نہیں بناؤ گے تو مکان کیسے تعمیر ہوگا ـــــ

دوسرا حصہ اپنا فلسفہ جھاڑنے میں لگا رہا،مگر درخت کی کٹنے،بالے پکھر بننے سے پہلے کی جو حالت ہے وہ بھی تو تعمیر ہے۔اس سے بعد کی حالت ہی تعمیر کیوں ہے؟ اینٹ بننے سے قبل جو مٹی کی حالت ہے وہ بھی تو تعمیر ہے اس سے بعد کی حالت ہی تعمیر کیوں ہے؟ اور پھر جب بنے بنائے مکان بم دھماکوں سے،زلزلوں سے،آگ اور سیلاب سے اڑ جاتے،تباہ ہو جاتے ہیں تو کیا یہ پھر سے تخریب نہیں ہے؟؟ تو کیا تعمیر بھی تخریب کے لیے کی جاتی ہے؟

اور ہاں اس تخریب کے بعد پھر تعمیر کہاں ہوتی ہے؟ ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوتی ہے تو کیا ہو بہو انہی عناصر سے تشکیل پاتی ہے جو پہلے اس کے جزو بدن تھے۔یا بالکل نئے عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔اور اگر دوسری تخریب کے بعد نئے عناصر سے ترکیب پاتی ہے تو کیا اس کو تعمیر کہنا روا ہے؟۔وہ چپ ہو گیا۔

تمہارے سارے سوال قابل جواب ہیں۔تم نے مجھے الجھانے کی سعی بیکار کی۔دوسرے حصے نے قدرے تضحیک آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے وضاحت کا آغاز کیا۔پہلے تخریب اس کے بعد تعمیر،تعمیر کے بعد تشہید،تشہید کے بعد تقلیب اور تقلیب کے بعد تنشیر کا مرحلہ آتا ہے۔کسان بیلچہ یا کدال ہاتھ میں لیتا ہے۔زمین کو کھود ڈالتا ہے یہ پہلا مرحلہ ہے یعنی تخریب،اس کے بعد وہ مٹی کے اندر بیج ڈالتا ہے۔پانی دیتا ہے۔پودا اگ آتا ہے۔اسکی پرداخت سے وہ درخت بن جاتا ہے۔یہ دوسرا درجہ ہے یعنی تعمیر ـــــ اب درخت کی لکڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔وہ اس کو کاٹ ڈالتا ہے۔اس کے حصے بخرے کر دیتا ہے۔یہ تیسرا درجہ ہے یعنی تشہید۔اب لکڑی کے مختلف قطع شدہ

ٹکڑے دھوپ میں سوکھتے ہیں اور سکھانے کے بعد کسان ان کو آگ میں ڈال کر ان پہ کھانا بناتا ہے۔لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے ـــــ تو لکڑی سے کوئلے کی حالت اختیار کرنا چوتھا مرحلہ ہے تقلیب کا ـــــ اور جب یہ کوئلہ راکھ بن کر اڑ جاتا ہے یا دوبارہ پیوند خاک ہو جاتا ہے تو یہ تشکیر ہے ـــــ آخری درجہ ـــــ یہاں دائرہ مکمل ہو جاتا ہے ـــــ دوسرے حصے نے لب بھینچ لیے۔

پورا شہر اندھیرے میں ہے۔اندھیرے میں تاریخ دروزہ سے گزر رہی ہے۔تاریخ کے گم ہو جانے پر کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا تو لوگ کیوں خوفزدہ ہیں؟میرے دماغ کے دونوں حصے خاموش ہیں۔جھگڑا نمٹ چکا ہے۔وقت اور تاریخ کا ہر واقعہ ہر ہر زاویہ مستدیر ہے۔ارتقاء اوپر سے نیچے کی طرف نہیں نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتا ہے۔بینائی نے اندھیرے کے ساتھ مفاہمت کر لی ہے۔گندلیں بیچنے والی بوڑھی جانے کہاں ہوگی؟میری سوچ بے ترتیب ہے ـــــ

میں سوچ کی اذیت سے نکلنے کے لیے سوچتی جا رہی ہوں۔نیچے سے اوپر کی طرف ارتقا ہے اوپر سے نیچے کی طرف زوال ہے ـــــ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کیا ہے؟؟؟سفر ہے شاید خالی سفر ہے ـــــ چاروں سمتوں کا بیک وقت سفر مستدیر ہے۔ارتقا،زوال،سفر در سفر ـــــ یہ چکر ہے چکر ـــــ یہ گولائی بھی مکمل ہوگئی ـــــ میری سوچ آوارہ ہو چکی ہے ـــــ

کیا تم نے کچھ نئے لفظ سیکھے ہیں؟میرے قریب سے ایک آواز آتی ہے۔آواز کا آواز اور سماعت سے رشتہ بحال ہو جاتا ہے۔بینائی کے بعد دو مزید حسوں کی بیداری نے میرے اندر سرخوشی بھر دی ہے ـــــ

ہاں ـــــ میں جواب دیتی ہوں۔

کیا تم نے دور دیسوں کے سفر کیے؟ آواز پھر آتی ہے۔

نہیں ـــــ میں جواب دیتی ہوں۔

تو پھر تم نے نئے لفظ کیسے سیکھ لیے؟؟ آواز میں حیرت ہے۔وہ پھر بولتی ہے۔

تم نے پہاڑوں پر وقت گذارا؟سمندروں کے سفر کیے؟صحراؤں کی خاک چھانی؟اجاڑ ویرانوں اور آباد شہروں کی طرف جانا ہوا؟طرح طرح کے لوگوں سے ملی؟قسم قسم کی تہذیبوں کو برتا؟ ہر طرح کے مذاہب کو پڑھا؟تواریخ کے اوراق الٹے؟؟؟؟؟؟

نہیں ـــــ نہیں ـــــ میں کانوں پہ ہاتھ رکھ کے چیخ پڑتی ہوں ـــــ بس کر دو ـــــ

تو پھر یہ دعوی کیونکر کیا تم نے کہ تم نے نئے لفظ سیکھے؟؟؟

میں سوال کرنے والی ہوں تمہاری طرح ـــــ سوالوں کے جواب نہیں دیتی ـــــ میں وضاحت کرتی ہوں۔

آواز قہقہہ لگاتی ہے ـــــ اور چپ ہو جاتی ہے۔

سوال کرنے والے سوچتے ہیں اور جب وہ سوچتے ہیں تو نئے لفظ بھی سیکھ جاتے ہیں ـــــ نیا تو کچھ بھی نہیں ـــــ سارے الفاظ،سبھی اعداد،سبھی آوازیں،لہجے تحریریں وجود میں آ چکی ہیں ـــــ تاریخ اور وقت کے غاروں،گھپاؤں،بلندیوں،مزاروں اور مقبروں کے اندر موجود ہیں ـــــ بس انہیں دریافت کرنا پڑتا ہے اور سوال کرنے والے دریافت کر لیتے ہیں۔مگر جواب دینے والوں کی جان پر بن آتی ہے ـــــ

ہر سوال کرنے والا جواب دینے والے پر فائق ہے۔کیونکہ سوال کے پیچھے طویل غور وخوض ہوتا ہے اور جواب اچانک دینا پڑتا ہے ـــــ ابھی کچھ دیر پہلے تم سوال کرنے والی تھیں اور میں جواب دینے والی ـــــ جب مجھے لگا کہ میں بے بسی کی دیوار بننے والی ہوں تو میں نے اپنی حالت تبدیل کر لی اور سائل بن گئی ـــــ

جواب دینے والے کی جان پر بن آتی ہے تو وہ لاچار ہو کر حملہ آور بنتا ہے۔اور سوال کرنے والے کی جان پر بنا کر رکھ دیتا ہے۔

دلیل سے شکست کھانے والے تشدد پر اتر آتے ہیں۔دماغ اور پھیپھڑوں کی جنگ میں آدمی مارے جاتے ہیں۔سوال کرنے والا دماغ لڑتا ہے جواب دینے والا پھیپھڑے۔اونچی آواز،گالیاں اس کے بعد بازوؤں کا مرحلہ آتا ہے اور پھر ـــــ اندھیرا چھٹ گیا ہے۔تاریخ کی زچگی مکمل ہو گئی ہے۔ہر طرف لہو ہی لہو ہے۔میرے چاروں اور گرم گرم لہو ہے۔اوپر،نیچے،دائیں،بائیں،آگے،پیچھے ہر سمت تاریخ کی کوکھ سے نکلا لہو پھیلا ہوا ہے ـــــ سوال کرنے والوں اور جواب دینے والوں کی تاریخ نے ایک بار پھر خود کو جنم دیا ہے ـــــ

میری آنکھوں میں،کانوں میں،ناک میں،حلق اور سینے میں ہر طرف لہو ہے ـــــ تاریخ سے لاعلمی پہ میرا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔اور اب جب کہ تاریخ نے خود کو زندہ کیا ہے تو سب کچھ ہی بگڑ چکا ہے۔

تصویر

آؤ،آؤ یہاں بیٹھو اس صوفے پر سفید بالوں والے پینسٹھ سالہ آدمی نے اس کو نشست گاہ کی دروازے کے سامنے والی پچھلی دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بٹھا دیا اور خود دوبارہ بغلی کمرے میں غائب ہوگیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سکڑ کر وہاں بیٹھ گئی جب گھونگریالے سفید بالوں والا وہ پینسٹھ سالہ مصور دوبارہ نشست گاہ کی طرف لوٹا تو وہ آس پاس کی دیواروں کا جائزہ لے چکی تھی وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا تو تیسری دیوار کی طرف گھورنے کا آپشن بھی ختم ہوگیا۔ اس کی نظر دوبارہ دائیں طرف والی دیوار کی طرف اٹھ گئی شاہکار تصویر تھی برتھ آف اپالو؟ اس نے مصور کی طرف سوالیہ دیکھا ہاں مصور کی نظروں نے اس کی نظروں کی متابعت کی مگر کچھ تشنگی ہے سر معاف کیجئے گا—— وہ بدمزہ ہوئی کیا تشنگی ہے؟ مصور کی آواز کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی مستی درآئی ''اپالو'' —— یونان کا مردوجہیہ،مردانہ وجاہت کا نشان، تصویر کے اندر کامل عریانی کے ساتھ نیم دراز دکھایا گیا تھا کہنی کے بل نیم دراز اپالو کتابی چہرہ، گھونگھریالے بال، سنہری کھال، بھوری آنکھیں، گھٹا ہوا مضبوط بدن، بازوؤں اور رانوں کی مچھلیاں نمایاں، گٹار کے تار کی طرح تنا ہوا پیٹ، کلائیاں اور پنڈلیاں مضبوطی کی گواہی دیتی ہوئی چیتے کے جیسی پتلی کمر، ریڑھ کی ہڈی کی طرف کھنچی ہوئی ناف سب مکمل ہے مگر——

ہاں مگر کیا؟؟؟ مصور کی بھاری مخمور آواز ابھری......

مگر یہ کہ سر!!!! وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور تصویر کے سامنے جا کر شہادت کی انگلی ''اپالو'' کے وسط میں رکھ دی یہ کچھ نامکمل میرا مطلب ہے نابالغوں جیسا—— آئی مین سر۔ اپالو کے مکمل بالغ وجود کے ساتھ یہ عدم مطابقت ہے وہ چکرا گئی—— مصور بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا یہ اس کی معصومیت کے اظہار کیلئے کرنا پڑا۔

عجیب بات ہے معصومیت کے اظہار کیلئے کس علامت کا سہارا لیا آپ نے سر! وہ دوسری طرف مڑ گئی مقابل کی دیوار پر اس کی آنکھیں چپک گئیں برتھ آف وینس؟

ہاں!!

پانی میں نہا کر ساحل پر پاؤں دھرتی ہوئی وینس جس کے بدن کی چادر ناف تک ڈھلک آئی تھی اور اوپر کا سارا بدن عریاں تھا اعضاء کے تناسب کا شاہکار—— کہ آج تک دنیا میں مقابلہ حسن کے لیے اسی کے بدن کے خطوط کو معیار مانا گیا ہے وہ وینس کی ناف کے اندر کہیں کھوسی گئی۔

تمہاری فن پارے کو جانچنے کی صلاحیت کافی اعلیٰ ہے۔

شکریہ سر!

ایک بات کہوں سر میرے دماغ میں ایک عجیب سی تجویز آئی ہے۔

بولو کیا تجویز ہے۔

وینس کے بدن سے زیادہ متناسب اور پرکشش بدن رکھنے والی عورتیں بھی ہیں دنیا میں پھر دنیا کی حسین ترین عورت کا ٹائٹل اسی کو کیوں مل جاتا ہے جو اس کے اعضاء سے مطابقت رکھتی ہو بت پرستی نہ گئی ہمارے اندر سے۔ ہم پتھروں کو معیار بنا لیتے ہیں۔

پتھر کا کیا ہے اس میں؟ ہاں! وہ تو پتھر ہے یہ تو فنکار کو خراج جاتا ہے یہ مونا لیزا، وینس، اپالو، یہ سب کچھ تو مائیکل اینجلو، لیونارڈو ڈاونچی، پکاسو، کو کریڈٹ جاتا ہے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں مصور نے طویل وضاحت پیش کی تو اس نے اپنی آنکھیں واپس پھیر لیں معصومیت کا اظہار اور خوبصورتی کا اظہار آمنے سامنے لگی ان دونوں تصویروں کا عنوان یہ ہونا چاہیے ''حسن اور معصومیت ان کے اظہار میں ہے''

اس نے طنز کیا ادھیڑ عمر مصور اس طنز کو برداشت کر گیا ہاں ان کے اظہار میں حسن اور معصومیت ہے اس میں کیا شک ہے مگر ان کے استعمال سے معصومیت اور حسن کی لازوال قدریں شکست بھی ہو جاتی ہیں مگر ناجائز استعمال سے ان کو آمنے سامنے کیوں لگا دیا آپ نے اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے الگ کر دیا مگر آمنے سامنے کر دیا اذیت رسانی کی انتہا ہے۔

تم سوال بہت پوچھتی ہو کیوں؟

سوال اس لیے پوچھتی ہوں تاکہ خود کوئی گمان کرنے سے بچوں۔ جب سوچنے والے کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملتا تو پھر وہ خود ہی کوئی نہ کوئی جواب ڈھونڈ نکالتا ہے اور بعض اوقات یہ

خودساختہ جواب غلط بھی ہوتا ہے اور غلط جواب اگر پختہ ہو جائے تو تقدیر پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے ہم بہت سی باتیں جواب نہ ملنے پر خود ساختہ طور پر طے کر لیتے ہیں اور پھر سزا پاتے ہیں وہ واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

میری پینٹنگ بنائیں وہ پر اعتماد ہوتے ہوئے بولی۔

تمہاری آنکھوں کو میں پینٹ نہیں کر سکوں گا۔ بھاری آواز گونجی۔

کیوں؟ تم کسی پر اعتبار نہیں کرتیں۔

کرتی ہوں۔

کس پر؟

اپنے آپ پر____

یہ کافی نہیں ہے کسی اور پر بھی کرنا پڑے گا خود سے ہٹ کر۔

خود سے ہٹ کر تو قابل اعتبار کوئی بھی نہیں ہے مگر اس اعتبار، نا اعتباری کا پینٹنگ سے کیا تعلق ہے؟

بہت گہرا تعلق ہے آنکھ کے تاثر کے بغیر تصویر لایعنی ہے بے معنی اور بے اثر ہے تصویر کا سارا تاثر ہی آنکھ کے اندر تشکیل پاتا ہے وہاں سے وہ پورے چہرے اور پھر پورے سراپا کی طرف پھیلتا ہے اور تصویر جاندار اور زندہ لگنے لگتی ہے دنیا کا کوئی بھی رنگ ساز، رنگ باز، آنکھ کے ہر تاثر کو رنگوں کا چولا پہنا سکتا ہے مگر بے اعتباری کو نہیں بے اعتباری پینٹنگ نہیں ہو سکتی یہ رنگوں کے قابو میں نہیں آتی لہذا تمہاری تصویر بنانا بے کار ہے مصور نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں اعتبار کیسے قائم کروں اپنے اندر؟ وہ روہانسی ہو گئی۔ قدم قدم پر عشاق کے قافلے رواں دواں ہیں جتنے دماغ اتنے الفاظ، جتنے منہ اتنی باتیں ایک دوجے سے بڑھ کر عشق و محبت کے دعوے کرنے والے موجود ہیں اب تو لفظوں سے بھی اعتبار اٹھ گیا لفظ بھی بے وقعت اور فضول ہو گئے ہیں کوئی انوکھے سے انوکھا لفظ بھی سرخوشی نہیں دیتا گر یہ کناں آنکھ کو تو مصور کیا جا سکتا ہے ناں؟

مصور اس کو دیکھتا رہا اور دھویں کے مرغولے اڑاتا رہا کوئی تو ہوگا جو اعتبار بن کر تمہارے دل کی دھرتی میں گڑا ہوا ہے بوڑھے مصور نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گرا دیں ہاں ہے اس کی آنکھوں سے پانی ابل پڑا۔

پھر؟

مگر وہ خود سے ہٹ کر نہیں ہے اس کو میں کبھی اپنے وجود، روح ضمیر، وجدان، لاشعور سے الگ نہیں کر سکی مجھ میں بڑی انا تھی مجھے جب لگا کہ میں کہیں گم ہو رہی ہوں اور میری جگہ کوئی اور گھیرتا جا رہا ہے تو میں نے بڑی کوشش کی۔ بڑے ہاتھ پاؤں مارے مگر اسی کوشش میں وہ میرے اندر سماتا چلا گیا اور یہاں شرط یہ ہے کہ خود سے الگ ہو کر کسی پر اعتبار کروں۔ بوڑھا مصور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی میں چلتی ہوں اس نے ہینڈ بیگ کے سٹریپ کو پکڑا ذرا سا رکی اور پھر دروازے سے باہر نکل گئی۔

شام کافی سرد تھی پہاڑوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں شائیں شائیں کرتی گزر رہی تھیں مگر ہال کے اندر ہلکی پھلکی بدن کی ٹکور کرنے والی حرارت تھی۔ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ مصوری کے موضوع پر کانفرنس تھی تو وہ بھی چلا آیا سٹیج کی پشت پر لگی سکرین پر سائیڈ شو میں تصویریں چل رہی تھیں وہ مقرر کی تقریر سے زیادہ ان تصویروں کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنے بائیں طرف سے ہلکی سی خوشبو آئی مفلر کے اندر اچھی طرح لپٹی ہوئی گردن کو اس نے ہلکا سا موڑا تو آنکھیں سیدھی اس کے ماتھے کے ساتھ جا ٹکرائیں اور وہاں سے پھسلیں تو آنکھوں پر اٹک گئیں وہ بھی اس کی طرف دیکھ چکی تھی۔

ہائے کیا حال ہے۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا

ٹھیک ہوں اچھی لگ رہی ہو وہ ہاتھ تھامتے ہوئے بولا

کب آئی ہو؟

آج ہی آئی ہوں۔

بتا دیتی!!!!

کیا فرق پڑتا ہے مل تو گئے ہم

ہمسائے جو ہیں ہمسایہ ٹھنڈ میں گرم چادر کی بکل جیسا ہوتا ہے جب دیار غیر میں ملے وہ مسکرائی عجیب سی سرخوشی کے ساتھ اس نے اس کے ہونٹوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تمہاری اس لپ اسٹک کا رنگ کونسا ہے؟

جامنی ہے وہ پھر مسکرائی۔

ایک دلنواز سی حدت پھیل کر اس کو گھیرے میں لے رہی تھی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ساتھ ساتھ بیٹھ کر ایک دوسرے کے سانسوں کو محسوس کرنا بھی ایک راحت ہے مقرر کیا کہہ رہا تھا اس نے

نہیں سنا اس کی ساری حسیات ساتھ والے سانسوں پر مرتکز تھیں جو اس کے سانسوں کے ساتھ مل کر ایک ہالہ بنا رہے تھے درد جو ہر وقت بدن کو کاٹتا رہتا تھا تب کہیں سو گیا تھا اس نے مفلر پر ہاتھ رکھا بعض جسموں کی محض موجودگی ہی روح کو سرشار کر دیتی ہے وہ اس وقت سامنے کی طرف متوجہ ہو چکی تھی مگر بیٹھی اس کے ساتھ تھی اس کو اس خیال سے ہی تسکین ہوئی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھی سانس لے رہی ہے۔

سانس لینا بھی کیسی عادت!! بے اختیار اس نے گلزار کی یہ لائن پڑھی جیے جاتے ہیں جیے جاتے ہیں

عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں

جیے جانا بھی کیسی عادت ہے وہ مسکرائی

تم ہر وقت جس درد کو کاٹتے ہو ناں وہ میری روح کو بھی چھیدتا رہتا ہے وہ سرگوشی میں بولی وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

جامنی رنگ جب پھیلتا ہے تو شفق کی تصویر بن جاتا ہے جس کے نیچے سمندر بہہ رہا ہو ہاں سمندر۔ ابد او رازل کے کنارے کہاں ملتے ہیں ازل اور ابد کے احساس کے اندر سکون ہے جامنی رنگ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے لہر کے اوپر لہر آتی ہے وہ زندہ ہے توانا، جیتا جاگتا شور مچاتا ہوا کف اڑاتا ہوا رواں دواں اس کے اندر حیات ہے وہ دیکھو اس نے انگلی سے سکرین کی طرف اشارہ کیا وہ حیرت سے اس کو تک رہی تھی۔

کیا کہہ رہے تھے تم؟ سکرین پر تو لیونارڈو کی ''دی لاسٹ سپر'' دکھائی جا رہی ہے چلو اٹھو کہیں چلتے ہیں وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا ہال کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ باہر آ گئے باہر رات سیاہ اور گھنی تھی وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے رات ان کے آس پاس سے ہو کر گذرنے لگی تھی۔

کیسا ہے تمہارا وہ؟

ٹھیک ہی ہوگا میری بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی۔

کیوں اتنے عرصے تک لاتعلق کیوں ہو جاتی ہو تم؟

شاید ہم دونوں ایک جیسے ہیں اس لیے

مقناطیس کے دو ایک جیسے پول ایک دوسرے کو دور دھکیلتے ہیں اور دو مخالف پول کھینچ کر ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اس نے قدیم فلسفے کا سرا پکڑا۔

وہ مقناطیس ہے انسان نہیں وہ چڑ گئی پتا نہیں کیوں تم لوگوں نے مادی اشیاء کے خواص اور ذمہ داریوں کو انسانی رویوں اور تعلقات کے ساتھ جوڑ لیا ہے لوہے اور پتھروں کی مثالیں لے کر آ جاتے ہو ریاضی کیا کہتی ہے دو نفی بھی آپس میں مل جائیں تو اثبات ہے دو اثبات آپس میں مل جائیں تو بھی اثبات ہے اور اگر نفی اور اثبات مل جائیں تو بھی نتیجہ وہی ہے اثبات'' جب ہر چیز کا جواب اثبات ہے تو پھر دو مخالف پول والا بکواس کیا ہے اور کیوں ہے اور اس کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے ہونہہ ——

تاریکی ان کے آس پاس سے سرک رہی تھی دونوں بہت قریب قریب چل رہے تھے وہ اس کے ساتھ چلتا رہا اس کے بدن کو چھونے کی خواہش اس کے لہو کے خلیوں کے اندر جڑ پکڑ رہی تھی وہ لاتعلقی سے چل رہی تھی عجیب عورت ہے یہ پھیکی، بے رنگ، گہری۔ الگ الگ، آزاد بے ربط لفظ اور خیالات اس کے دماغ سے نکل نکل کر ٹھنڈے برفائے ہوئے اندھیرے میں گم ہوتے گئے اس کا مرکز سلامت تھا وہ اپنے مرکز کو بچائے ہوئے تھی سلامت رکھے ہوئے تھی پھیکی، بے رنگ، گہری اور الگ تھلگ وہ جانتا تھا کہ اس کی اس کو چھونے کی خواہش تشنہ تکمیل ہی رہے گی۔

بوڑھا مصور رنگوں کے سٹروک لگا رہا تھا سٹروک پر سٹروک لگائے جا رہا تھا رنگ بکھر رہے تھے پھیل رہے تھے وہ سنگی مجسمے کی طرح پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی بوڑھا اس کی طرف متوجہ نہیں تھا وہ وحشیانہ انداز میں کینوس پر سٹروک لگا رہا تھا رات کے منتشر اور آوارہ ٹکڑے ادھر اُدھر کونوں کھدروں، سوراخوں اور نیچی چھت کے گھروں کے اندر پناہ لیے ہوئے تھے دن دھندلایا ہوا تھا سارے رنگ، سبھی رنگ اپنی اپنی شناخت سے ورا ہی ورا تصویر کے قالب میں ڈھلتے جا رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں اعتبار تو نہیں تھا وہ مرکز کو سنبھالے بیٹھی تھی مصور ہانپتا ہوا تھک ہار کر بیٹھ گیا اور ایک کنج لب کو ذرا سا کھینچ کر اور ایک آنکھ قدرے میچ کر اس نے طنزیہ اس کی طرف دیکھا مصور نے رنگوں کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا آنکھ سے اوجھل پس منظر اور پیش منظر میں اتنے رنگ بھر دیئے تھے کہ ناظر کی آنکھ اس کے مرکز کی طرف جا ہی نہ سکتی تھی وہ راستے کے رنگوں کے بہکاوے کی شکار ہو جاتی تھی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے آئی کینوس پر رنگوں کا سیلاب امڈ آیا تھا اس نے ہاتھ آگے بڑھایا نیلے، پیلے، سرخ، سبز، جامنی، کاسنی، سرمئی رنگوں کے دریا اس کے ہاتھوں کے ناخنوں سے پھوٹ بہے بصارت کو رنگوں نے لپیٹ لیا۔

تصویر مکمل تھی۔

خانے اور خوف

زندگی کتنے خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر خانے میں ادھوری اور تشنہ ہے۔ کہیں مذہب کا خانہ ہے تو کہیں رسم کا، کہیں اقدار کا خانہ ہے تو کہیں اقتصاد کا، کہیں ذات پات کا خانہ ہے تو کہیں فرقے کا، آخر ایک انسان خود کو کتنے خانوں میں تقسیم کرے اور کس کس خانے میں ایک مکمل فعال کردار ادا کرے۔ کچھ ایسے ہی خیالات کی دنیا بنی وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ روشنی جلانے کے لیے ہاتھ ہلایا تو بجلی ہی نہیں تھی۔ بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔

تیسری دنیا کے ممالک اور اُن کی عوام کا المیہ یہی تو ہے۔ یہ زندگی یہ زندگی کے ہزار ہا خانے، اور سارے خانے ادھورے، سسکتی، بلکتی، سلگتی اور تڑپتی ہوئی مخلوق سے بھرے ہوئے خانے، جس طرح بھیڑ کے کان میں کیڑے پڑ گئے ہوں، اُن کلبلاتے کیڑوں کی مانند سسکتے ہوئے انسان اور اُن پر حکومت کرنے والے بھیڑیے، کیا زندگی ہے یہ، یہ زندگی عذاب ہے۔ عذاب ہے؟

کیا ہوا کیوں چلا رہی ہو؟ ماں نے کمرے میں آ کر پوچھا

پھر بجلی نہیں ہے۔ اتنے زیادہ کام رُکے پڑے ہیں۔ یہ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی حرکت رہ گئی ہے، وہ پھٹ پڑی تھی۔

تو میں کیا کروں بیٹا!۔ ماں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ اب ابا کا لیکچر شروع ہو جائے گا وہ جانتی تھی۔ خاموشی سے اُس نے اپنا تھکا ہوا بدن بستر پر گرا دیا اور اپنے پسندیدہ کام میں مشغول ہو گئی۔

سوچنا اس کا پسندیدہ کام تھا۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ شہد کی مکھی بھنبھناتی ہوئی اس کی پلکوں سے ٹکرائی اور شہد نما عجیب سی

خوشبو چھوڑتی ہوئی گذر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی مخلوق کو انسان کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ اس شہد کی تخلیق اور تشکیل میں نہ جانے کتنا ہی لمبا سفر کرتی ہے۔ اور انسان کا ایک لقمہ بنتا ہے۔ مگر انسان کی ہوس ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ انسان نے تو اس پیاری اور ننھی سی مخلوق کو بھی مزدوری پر لگا دیا ہوا ہے۔ اس کے اختیارات پر مختار ہو گیا ہے اس کی سمتوں اور بلندیوں پر قابض ہو گیا ہے۔ اُس کو لکڑی کے ڈبوں اور ایک ہی سمت واپسی پر مجبور کر دیا ہے انسان نے، انسان کی ہوس کاری کی کوئی انتہا بھی ہے۔ مکھی بھنبھناتی ہوئی دور فضا میں جا چکی تھی۔ اُس کی نظروں نے دور تک اُس کا تعاقب کیا۔ یہ آزاد ہے، کیا یہ آزاد ہے؟ کیا آزاد ہے؟ فضا کے اندر رہ کر بھی اس کی آزادی سلب نہیں ہو چکی کیا؟ سوالات کی بازگشت اُس کے دماغ میں گونجتی رہی۔

یہ خانے بہت تکلیف دہ ہیں۔ زندگی کی کوئی ایک سمت نہیں ہو سکتی کیا؟ ہو سکتی ہے مگر ہم کرنا نہیں چاہتے، ہم ان خانوں کے بٹوارے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے وجود سالم دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے آخر کیسے کر سکتے ہیں۔ اور پھر بے بسی کا احساس اس پر ٹوٹ کر گرا! اشرف الخلق کا دعویٰ کرنے والا اپنی قدروں، سمتوں، رواجوں، نظریوں، معیشتوں اور مذہبوں کا کس قدر قیدی ہے، کتنا انھونا اور شدید قیدی ہے۔

گوند سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں میں لکڑی کے بلاک پکڑے وہ ایک بلاک کو دوسرے کے ساتھ جوڑنے ہی والی تھی کہ وہ وارد ہوا۔ اور حسب معمول اس کے چھوٹے سے کارخانے کی کاؤنٹر کے سامنے رکھی واحد ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ خوبصورت سفید مردانہ ہاتھ کو کاؤنٹر پر بجا کر اس نے اس کو متوجہ کیا تو وہ چونکی اور بلاک کو اس کی مقررہ جگہ پر فکس کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

کیا حال ہے؟

ٹھیک ہوں۔ ابھی تک تمہارا یہ ڈیزائن مکمل نہیں ہوا، اس نے گردن گھما کر پیچھے گتے کی دیوار کے ساتھ رکھے کولاج کی طرف دیکھا۔ نہیں ابھی نہیں مکمل ہوا، ہر رات جب میں سوچتی ہوں تو اس کے اندر اور کچھ ایڈجسٹ کرنے کا مارجن بڑھ جاتا ہے اس نے نیم دلی سے جواب دیا اور ایک طرف دیوار کے ساتھ بیسن کی طرف بڑھ گئی۔

کیا پیئیں گے؟

جواباً وہ چُپ رہا۔ بس چُپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

میں نے کہا کیا پئیں گے؟ اس نے زور دے کر پوچھا

وہ اس دفعہ بھی کچھ نہیں بولا، بس اضطراری انداز میں انگلیوں کو میز کی چکنی سطح پر بجاتا رہا۔ اور نظروں سے اس کے چہرے کو!

وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

کبھی کبھی مجھے تمہاری بالکل بھی سمجھ نہیں آتی اجمیر!

سمجھ تو تب آئے ناں جب تم سمجھنا چاہو۔

سمجھنا تو چاہتی ہوں میں، مگر تم پکڑائی ہی نہیں دیتے۔

میں پکڑائی نہیں دیتا یا تم؟ لکڑی کے ٹکڑوں، چمڑے کے ٹکڑوں، کاغذوں، رنگوں، برشوں، چاقوؤں، آٹے کی لیوی، گوند کی ڈبیوں کا ایک ملغوبہ بن چکی ہو، تم وہ عورت ہو جس کے دماغ اور جسم کے درمیان کوئی ربط نہیں جس کا وجود، جس کے دماغ سے الگ ہو چکا ہے، دماغ کی ضروریات تو پوری ہو رہی ہیں مگر جسم______ وہ رک گیا۔ اس کی نظریں اس کے بدن کے گرد آگ کے لاوے پھینک رہی تھیں۔ تجسیم کو یوں لگا، گویا ابھی جل جائے گی اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ کسمسائی اور سمٹ سی گئی۔ شکر ہے زندگی کے آثار تو ہیں۔ اجمیر کے لبوں پر اب مسکراہٹ تھی۔ دماغ سے منقطع شدہ بدن نے اتنا تو اشارہ کیا کہ وہ زندہ ہے اور اسے کسی دوسرے بدن کی ضرورت ہے۔ اب وہ اسے ستانے پر اُتر آیا تھا۔

بس کرو اجمیر! مجھے میرے دائروں کے اندر ہی رہنے دو! تم شاید اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس کو تم مردہ اور دماغ سے منقطع شدہ کہتے ہو میرا یہ بدن زندہ ہے۔ افسوس کہ مرد کبھی عورت کے ضبط کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

اچھا اٹھو تر کھانی صاحبہ۔ چلو چل کر کہیں سے چائے پیتے ہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

ایک پرانی وضع کے ڈھابے کے باہر بیٹھ کر اُس نے اُترتی ہوئی رات سے لطف اندوز ہونا چاہا۔ اجمیر اس وقت بھی بے قرار نظر آ رہا تھا۔

میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے آجکل۔ وہ بولی۔

کیا؟

میں عجیب و غریب حبس کا شکار ہوں، قید کا احساس ہے، جیسے فرد کبھی بھی آزاد نہیں رہا۔ یہ

کتنا قیدی ہے، پشت ہا پشت سے، یہ کتنا قیدی چلا آ رہا ہے۔ اجمیر خدا نے نُطفے کو اتنا تو اختیار دیا ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے پیدا ہو سکے۔ کرب کے آثار! اس کے چہرے پر واضح تھے۔

یہ کیا کچھ سوچ لیتی ہو تم؟ اجمیر بھی اس وقت پریشان ہو گیا۔

کبھی کبھی مجھے بیٹھے بیٹھے اپنے اور تمہارے اس تعلق پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

وہ کیوں؟

مجھے لگتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے دائروں میں کہیں بھی فِٹ نہیں ہیں۔ اگر ہم فٹ نہیں ہیں تو ایک دوسرے سے کیوں منسلک ہیں؟ اور اگر ہم منسلک ہیں تو ہمارا ایک دوسرے کو فائدہ کیا ہے؟ وہ الجھی ہوئی تھی۔

کوئی بھی تعلق بے کار یا بے فائدہ نہیں ہوتا تجسیم! وہ بولا تو کافی دکھی لگ رہا تھا وہ سمجھ گئی تھی کیونکہ اجمیر جب بھی اس کا نام لے کر کوئی بات کرتا تھا تو ہمیشہ سنجیدہ ہوتا تھا۔

تم دوہرے معیار کے حامل شخص ہو اجمیر۔

وہ کیسے؟

کبھی کبھی تم سچے لگتے ہو اور کبھی جھوٹے، مکار، دھوکا باز اور فریبی اور پھر میں سوچتی ہوں کہ آخر میں تمہیں اتنا کیوں سوچتی ہوں۔ اگر تم مکار اور دھوکا باز ہو تو میں تمہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتی، مگر تم نے میرا بگاڑا بھی تو کچھ نہیں، تم خود میرے لیے اہم ہو چکے ہو۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ بے حد الجھی ہوئی تھی اور اکثر ہی وہ الجھ جاتی تھی۔

چلو اٹھو میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔ وہ چابیاں اٹھا کر کھڑا ہوا اور چائے پیئے بغیر ہی وہ اٹھ گئے۔ ہوٹل کا مالک ننھا حیرت سے اُن کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

برتن دھونے والی ماسی روز ہی کوئی نہ کوئی رونا لے کے آ جاتی ہے۔ اب تو اس کی باتوں پہ اعتبار نہیں رہا۔ یہ سارے غریبوں کی عادتیں پتا نہیں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں۔ غریب بدصورت بھی ہوتے ہیں۔ شاید کوئی جینیاتی مسئلہ ہے کہ غربت انسان کو بدشکل اور بدہیت بنا دیتی ہے۔ یا پھر شکل و صورت کے ساتھ معیشت کا کوئی تعلق ہے۔ ہاں شکل وصورت کے ساتھ معیشت کا تعلق ہے تو واقعی!! دنیا میں سب سے زیادہ مال دار طبقہ، فلمی اداکاراؤں، طوائفوں کا ہے اور ان کے پاس پیسہ بھی زیادہ

ہوتا ہے اور یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ اس طبقے کی عورتیں اور مرد جسم اور شکل وصورت کی کمائی کھا رہے ہیں۔

مصنوعی چیزوں، اور اجرتی جسموں کی بڑی زیادہ قیمت ہے دنیا میں۔
محنت کرنے والے جسموں کا معاوضہ سب سے کم ہے۔
دماغ کی محنت کی اجرت تو نہ ہونے کے برابر ہے۔
معاشرے کے نہ جانے کتنے بہاؤ ہیں۔

ایک طرف وہ بہاؤ ہے کہ دماغ سے کام لینے والے کی اجرت سب سے زیادہ ہے۔ نقشہ نویس سب سے زیادہ رقم لیتا ہے۔ اس کے بعد ٹھیکیدار ہے جس کا کام مزدوروں سے اجرت پر کام لینا ہے۔ وہ بس اشارے کرتا ہے اور جو سارا دن بازوؤں کی مچھلیاں اکڑا کے گارا ڈھوتا اور اینٹیں اٹھاتا ہے اس کا معاوضہ سب سے کم ہے۔ دوسرا بہاؤ یہ ہے کہ جو کہانی لکھتا ہے اس کا معاوضہ سب سے کم ہے، جو ہدایات دیتا ہے وہ تو محض اشارے کرتا ہے کام لیتا ہے، اور جو پرایا لباس پہن کر، مصنوعی چہرے کے ساتھ، کسی کے لکھے ہوئے مکالمے بول کر کسی کے اشاروں پر عمل کر کے مزدوری کر رہا ہے اس کا معاوضہ سب سے زیادہ ہے۔

نقشہ نویس	ٹھیکیدار	مزدور
کہانی کار	ڈائریکٹر	فنکار

یہ کیسے بہاؤ ہیں جو ایک دوسرے کے الٹ بہہ رہے ہیں۔ بدصورتی اور بدہیتی کا تعلق ضرور معیشت کے ساتھ ہے، پیسے کے ساتھ ہے، محنت کے ساتھ نہیں ہے۔ اور ان غریبوں کی عادتیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ جیسے بوڑھے اور چھپڑ اور کچی کالونیاں، دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں ایک جیسی ہی ہوں گی، عورت دنیا میں کہیں بھی چلے جاؤ، عورت ہی ہوگی اور مرد، مرد ہی ہوگا۔ پودے، پہاڑ، دریا، آسماں، سڑکیں سارے ایک جیسے ہی ہیں تو پھر اختلاف کہاں ہے؟ اختلاف شاید روّیوں کا ہے۔ روّیے بھی وہ جو اوپر سے اوڑھے جاتے ہیں۔ قائم کیے جاتے ہیں۔ استوار کیے جاتے ہیں۔ کیا سوچ رہی ہو؟ زارا نے اس کے سٹوڈیو میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

آؤ زارا، آؤ بیٹھو۔ اس نے سر کو میز سے اٹھا کر زارا کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ زارا کی نظروں نے دیوار کے ساتھ رکھے کولاج کا جائزہ لیا۔ یہ مکمل ہو چکا ہے۔

ہاں یار! دعا کرو اچھے داموں بک جائے۔

بک جائے گا۔ آج کل لوگوں کو بڑا کریز ہے ان چیزوں کا۔ نہ جانے کیسی کیسی الم غلم چیزوں کے ساتھ گھروں کو بھر لیتے ہیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ اچھا تو تم میری تخلیق اور محنت کو الم غلم کہہ رہی ہو۔ اس نے لمبی سانس لے کر بڑے اطمینان اور لطف کے ساتھ زارا کو چھیڑا۔

ارے نہیں بھئی یہ مطلب نہیں تھا میرا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ہمارے ہاں جو کلچر ہے وہ بڑا عجیب وغریب ہے۔ غیر ضروری اشیاء کے ساتھ گھروں کو بھر لیا جاتا ہے۔ ساری ساری عمر اُن کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ ایک طرف پیسہ فضول آرائش کی چیزوں پر ضائع ہو رہا ہے اور دوسری طرف وہ بھی لوگ ہیں جن کو چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کی سوکھی روٹی بھی میسر نہیں۔

سچ کہہ رہی ہو تم۔ یہ نظام نہیں بدل سکتا۔ یہ اتنی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو چکا ہے کہ اس کے لیے قیامت کی ضرورت ہے۔ پیسے کا بہاؤ ایک خودکارانہ طریقے سے ایک طرف ہو چکا ہے اور یہی چیز مقدر کے نام سے یاد رکھی جاتی ہے اس کے لہجے میں دکھ اور کرب کی گہری کاٹ تھی۔

اچھا چھوڑو تم پھر جذباتی ہو رہی ہو۔ یہ بتاؤ کہ اجمیر کے ساتھ شادی کب کر رہی ہو؟ اتنی اچھی انڈرسٹینڈنگ ہے تم دونوں کی۔ کیوں نہیں کوئی فیصلہ کر لیتے اور ہاں اس سوال کا جواب دینے سے قبل چائے پلاؤ مجھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیوار کے ساتھ رکھے میز پر پڑی الیکٹرک چائے دانی میں پانی ڈالا اور بٹن دبا دیا۔ بجلی نہیں ہے۔ ایک بے بس مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پیدا ہو کر بجھ گئی۔

جہاں تک تمہارے اس سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں اجمیر سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور دوسری بات یہ کہ ہر تعلق کا ضروری مطلب شادی تو نہیں ہوتا۔

کیوں، مگر کیوں شادی نہیں کر سکتی تم اس سے؟ زارا کا دماغ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

یار اس کے کچھ Complexes ہیں۔ جن کو میں سمجھتی ہوں۔ اور جانتی ہو جہاں انسان ایک دوسرے کو مکمل طور پر سمجھ جاتا ہے وہاں گیم ختم ہو جاتی ہے اب ہم دونوں خواہ مخواہ ہی ایک دوسرے کے ساتھ نتھی ہیں۔ ایک خودکار جبلت کے تحت۔ ورنہ وہ جو ایک دوسرے کو جاننے، کھوجنے، معلوم کرنے کی کشش اور تجسس ہوتا ہے وہ کب کا ختم ہو چکا ہے۔ اس نے گہرا سانس لیا تو کیا اب تم دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق ہو سکتے ہو؟

ہاں بڑے آرام سے۔ اس نے کندھے اُچکائے۔

نہیں۔تم جھوٹ بول رہی ہو۔ زارا نے اس کو غور سے دیکھا۔ یہ گہرا سانس جو اطمینان کے اظہار کے طور پر تم نے خارج کیا ہے اس کے پیچھے آگ تھی۔ زارا اس کو کھوج رہی تھی۔

شاید۔ کہہ کر اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔

میں ایک غریب آرٹسٹ ہوں زارا۔

آرٹسٹ غریب نہیں ہوتا تجسیم! آرٹسٹ ہی تو امیر ہوتا ہے۔

امارت اور غربت کو اقتصاد کے پیمانے سے تولو میری بہن۔تم بعض اوقات کتابوں کی باتیں کرنے لگتی ہو۔

اجمیر کو تم سے محبت ہے وہ تم میں پناہ لینے آتا ہے اسے قدر ہے تمہاری۔زارا جذباتی ہو گئی۔

تم سے کس نے کہہ دیا کہ اس کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ اس کی آنکھوں میں گھور کر بولی۔

میرا دل کہتا ہے۔

دل جھوٹ کہتا ہے زارا۔ اجمیر کی زندگی میں دوہرے معیارات ہیں۔ میں تجسیم ہوں۔ میں ان دیکھی چیزوں، خیالات اور تصورات کو جسم عطا کرتی ہوں۔ اجمیر کے حِسی تقاضوں کی تسکین میرے ہاں آ کر ہوتی ہے۔اس کے نفسیاتی اور حِسی اظہاریئے یہاں آ کر تشکیل پاتے ہیں۔مگر اس کا دوسرا معیار مادی ہے۔ بیوی ایک مادی چیز ہے۔اس کا خاندانی پس منظر سیاسی اور اقتصادی ہے۔اس کے خاندان نے اس پر روپیہ لگایا ہے وہ خاندان کی انویسٹمنٹ ہے اور کوئی بھی نہیں چاہے گا کہ اس کی انویسٹمنٹ ضائع چلی جائے۔اسے مضبوط سیاسی پس منظر رکھنے والی یا کسی بڑے سرمایہ دار خاندان کی لڑکی چاہیے جو مادی بنیادوں پر اس کو سہارا دے سکے۔

میاں بیوی کے رشتے کو تم مادی سمجھتی ہو؟ زارا نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں! سمجھتی نہیں ہوں۔ یہ رشتہ ہے ہی مادی۔ اس نے بڑے اعتماد سے دعویٰ کیا۔ دیکھو زارا۔میاں بیوی کا رشتہ مادی اور حیوانی رشتہ ہے۔سماجی اور معاشی رشتہ ہے۔عورت کو مرد کی ضرورت ہوتی ہے جسمانی اور معاشی سطح پر۔ایک شوہر کی وفات کے بعد وہ کس بات کو یاد کر کے روتی ہے؟ اس کی کمائی کو۔اس کے کاموں کو، اس کے مادی سہاروں کو۔کما کے لاتا تھا۔ بچوں کو سنبھالتا تھا۔ یہ کام بھی وہ کرتا تھا وہ کام بھی وہ کرتا تھا۔ جب عورت کے کندھوں پر ہر ہر ذمہ داری پڑتی ہے تو اس کو وہ یاد آتا ہے۔ بہت زیادہ محبت کرنے والی بیوی کا شوہر بھی اس سے لاتعلق ہو جائے اس کو معاشی سہارا

نہ دے تو اس کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے اور وہ ہر جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے۔ جادو ٹونہ، تعویز گنڈہ، جو کچھ بھی اس سے ہو سکے وہ کرتی ہے۔اور دوسری طرف مرد کا بھی یہی حال ہے۔ بیوی اس کو ضرورت کے لیے یاد آتی ہے۔ یہ ہمارے معیارات کے خانے ہیں جن میں ہم تقسیم ہو چکے ہیں۔ اپنے ہی لہجے کی بے بسی کو محسوس کر کے وہ چُپ ہو گئی۔

وہ تمہیں اب بھی عزیز ہے۔ زارا نے اور کُریدا

ہاں وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ بہت معصوم انسان ہے نفسیاتی سطح پر، جذباتی سطح پر اتنا شفاف ہے کہ فوراً دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ چھپ نہیں سکتا۔لیکن بعض اوقات جب وہ چھپنا چاہ رہا ہوتا ہے تو میں اس کو دیکھ کر بھی چھپنے دیتی ہوں۔ میں جان کر بھی انجان بن جاتی ہوں۔ میں اس کا بھرم رکھنے کے لیے ایسا کرتی ہوں۔ جب کوئی شخص اپنے منہ سے یہ کہتا ہے کہ وہ دھوکا دینے میں بڑا ماہر ہے تو اس وقت لاچارگی اور کرب کی انتہا سے گزر رہا ہوتا ہے۔ وہ خود کو Hurt کر رہا ہوتا ہے۔

چھوڑ و یار کوئی اور بات کرو۔

خوف آدم کی سرشت میں بٹھائے گئے ہیں۔ اور یہ خوف دراصل دھوکا ہیں۔ میں جب تک دوسروں کے دکھائے ہوئے منظر دیکھتی رہی کائنات کا مفہوم میرے لیے کچھ اور رہا۔ دوسروں کے دماغ سے چیزوں کو سمجھنے کا عمل بھی بہت سادہ اور آسان تھا۔لوگوں کی زبان سے لفظ اُچک کر بولنا بھی سہل لگتا تھا۔ میں معاشرے کی طرزِ فکر کا طفیلیہ تھی پھر ایک دن یوں ہوا کہ مجھے اپنی شناخت مل گئی اب مجھ پر آگہی کے عذاب اترنے لگے، میں بُت تھی۔ چابی والا کھلونا تھی، گڑیا تھی۔مگر مجھے وجود مل گیا میں بینا ہو گئی۔ میں خود بولنے لگی۔خود سمجھنے لگی اور خود محسوس کرنے لگی جیسے ہی میں نے شعور اور وجدان کا لباس پہنا میں دنگ رہ گئی۔ مجھے جو سفید دکھایا گیا تھا وہ سیاہ تھا۔ جو حسین دکھایا گیا تھا وہ بدصورت تھا۔ جو پُرسکون دکھایا گیا تھا وہ متلاطم تھا۔ان دھوکا دینے والے بازی گروں میں ماں کا پہلا نمبر ہے۔ جب میں اس کی گود میں تھی تو وہ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے بلی جیسے کمزور اور معصوم جانور سے مجھے ڈراتی تھی۔ ''وہ دیکھو بلی آ رہی ہے تمہیں کھا جائے گی'' اور میں سہم کر خوفزدہ ہو جاتی تھی ماں کی گود سے موت کا خوف میری سرشت میں پڑا تھا۔ جب میرا وجدان میرے حواس اتنے مکمل نہیں تھے تب بھی اپنی بقا کا احساس میرے اندر تھا۔ ماں نے کتنے ہی خوف میرے اندر بھرے۔ آگ کے قریب نہ جاؤ۔ یہ جلا دے گی، پانی کے پاس نہ جاؤ ڈوب جاؤ گی، چھت کی دیوار پر مت لٹکو گر جاؤ گی۔ دھوپ میں نہ گھومو بیمار ہو جاؤ گی، بارش میں مت بھیگو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ ماں میرے

گر د زندگی کا دائرہ بڑھانے کے چکر میں موت کے خوف کے پہرے بٹھاتی گئی۔ اور اس کا نقصان یہ ہوا کہ میری فطرت کی مہم جوئی مسخ ہوگئی۔ میری سرشت میں تجربے اور ایڈونچر کا جو تجسس تھا وہ مر گیا۔ میں بزدل ہوگئی۔ اور یہ خوف یہیں پر ختم نہ ہوئے بلکہ ان خوفوں کا دائرہ بڑھتا گیا۔ تصویریں نہ بنایا کروان میں جان ڈالنی پڑتی ہے۔

قیامت کا دن، حشر کا دن، روزِ جزا کا دن اور اللہ کا تصور درمیان میں آنا شروع ہو گیا۔

اللہ سے میرا پہلا تعارف یہ تھا۔

یہ نہ کرو۔ اللہ ناراض ہو جائے گا۔

وہ نہ کرو۔ اللہ مارے گا۔

اللہ بڑا سخت ہے دوزخ میں جلائے گا۔ اللہ اتنا سخت تھا۔ سارے بڑے بڑے بدکاروں، ظالموں، لٹیروں، سفاکوں کو کھلی چھٹی دے کر میرے اوپر ایک ننھی سی بچی کے اوپر سرخ سرخ نظریں گاڑ کے بیٹھا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز شدید سرخ آندھی آئی۔ کچے گھر کے کھلے صحن کی ساری دھول اڑ کر فضا میں سما گئی۔ میری خوفزدہ ماں سارے بچوں کو لے کر کمرے میں گھس گئی۔ کبھی میری ماں بھی لڑکی ہوگی۔ ہمیں تو ہمیشہ اسی طرح بوڑھی لگتی ہے۔ لگتا ہے ماں پیدا ہی اسی حالت میں ہوئی تھی۔ ماں نے سرگوشی میں بتایا کہ ایک لڑکی قتل ہوگئی ہے۔

امی قتل کیا ہوتا ہے؟ میں نے پوچھا تھا۔ تو ماں نے وضاحت کی کہ کچھ لوگوں نے لڑکی کو پکڑ کر مالٹے کے بوٹے کے ساتھ کپڑے کا پھندا دے کر مار ڈالا ہے۔

امی اس لڑکی نے کیا کیا تھا؟

وہ گھر سے باہر نکلی تھی دوپہر کو۔ یہ کہہ کر ماں خاموش ہوگئی۔

امی دوپہر کو گھر سے باہر نکلنا اتنا بڑا گناہ ہے؟ ماں چپ رہی ،اس نے مالٹا توڑا ہوگا؟ بھائی نے قیاس ظاہر کیا۔ ماں پھر بھی چپ رہی۔ ماں کی چپ نے ایک اور خوف کو راہ دے دی۔ اب دوپہر کو گھر سے باہر نکل کر جولائی کی شفیق گرم دھوپ اور سحر انگیز لہروں کی جھلمل جسے ہم سمجھتے تھے کہ گیدڑوں نے تنور گرم کر رکھا ہے۔ اس دھوپ میں کچے امرود توڑنے، بیر چننے اور خالی پڑی ہل چلی زمینوں کے اندر ''ٹیٹری'' کے انڈے تلاش کرنے کی عیاشی سے محروم ہو گئے۔ زندگی جو دور دور کھیتوں تک پھیلے درختوں، پودوں، جڑی بوٹیوں سے بھی آگے پھیلی ہوئی تھی وہ گھر کے پچھواڑے کی

ٹھنڈی چھاؤں پر سٹاپو کھیلنے تک محدود رہ گئی۔ اور پھر ہم یہ سٹاپو کھیلتے کھیلتے اکتا گئے۔ کتنے ہی حسین، خوبصورت تجسس تھے جن پر خوفوں کے ناگ غالب آتے گئے اور پھر ایک دن چلتے چلتے میں نے سارے خوفوں کو اس طرح اتار دیا جس طرح سانپ کینچلی سے نکل جاتا ہے اور زندگی کی بھیڑ میں کھو گئی۔

سارا الزام اللہ پر جا کر ٹکتا، اللہ نے اس لڑکی کو گھر سے باہر نکلنے کی اتنی بڑی سزا دی تو اللہ اُن کو کیوں سزا نہیں دیتا جنہوں نے لڑکی کو مار ڈالا تھا اور خود بھاگ گئے۔ اللہ بڑا One sided ہے۔ اللہ کو الزام کیوں نہ دیتے۔ ہمارے اندر سارے خوف ہی تو اس کے نام پر بٹھائے گئے تھے۔ ہم تو کسی کو تنگ بھی نہیں کرتے ہیں۔ پھر بھی اللہ ہم سے ناراض ہوتا ہے۔ ماں نے سہم کر کہا تھا وہ دوپہر کو اکیلی باہر نکلی تھی۔ پھر ماں چپ کر گئی تھی۔ یعنی اس کا یہی قصور تھا۔ پھر پابندیاں لگنا شروع ہو گئیں۔ گھر سے باہر نہیں نکلنا، کسی سے بات نہیں کرنی۔ کوئی بلائے تو بھاگ کھڑے ہونا ہے۔ کسی سے کوئی چیز لے کر نہیں کھانی۔

سٹوڈیو کا دروازہ چر چرایا تو اس نے جلدی سے ڈائری کو بند کر کے دراز کے اندر رکھ دیا۔ اجمیر اپنے خوبصورت گھنے بالوں اور روشن چہرے کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مگر بے تاثر رہی۔ کچھ دنوں سے وہ عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔

تم پہلے جیسی نہیں رہی ہو کیا بات ہے؟ اجمیر کی آواز سرگوشی جیسی تھی اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ پورے کا پورا ہی آنکھوں کے اندر سمٹ آیا تھا۔ اور وہ ہمیشہ ہی اجمیر کی ان نظروں کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

میں خوفزدہ ہوں۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

کس بات سے خوفزدہ ہو۔ اجمیر پریشان ہو گیا تھا۔

ہمارے تعلق کی طبعی عمر پوری ہو چکی ہے اجمیر! اُس کے لہجے میں لرزش تھی مجھے لگتا ہے بہت جلد ہم ایک دوسرے سے لاتعلق ہو جائیں گے۔ ہر تعلق کی ایک نہ ایک معیاد ہوتی ہے اس کے بعد وہ تعلق اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے۔

کیا تم میرے بغیر رہ لو گی؟ اجمیر کی آواز بھرّا گئی۔

ہاں۔ اس نے بڑے رسان سے کہا

تعلق جب شکل بدلتے ہیں تو کیا وہ کوئی تکلیف نہیں دیتے؟ کیا وہ اتنے ہی آسان

ہوتے ہیں۔ جتنا آسان لباس کو بدلنا ہے؟ وہ اس کے لہجے میں چھپے طنز کو پہچان گئی تھی۔ بڑے جذب کے ساتھ بولی۔

آسان نہیں ہوتے بڑے مشکل ہوتے ہیں اور تعلق کو بھلا دینا بہت آسان ہے۔ جو کہتے ہیں ان کے لیے یہ مرحلہ اتنا ہی طویل اور مشکل ہوتا ہے۔ اور جو ابتدائی سٹیج پر گھبرا جاتے ہیں وہ بڑا جلدی جانبر ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اسے وہ دس سال کی بچی یاد آ گئی۔ جس نے پہلا تعلق ٹوٹنے کا کرب اٹھایا تھا۔ دیہاتی پرائمری سکول کی جماعت پنجم کی طالبہ جو دل میں اپنے سے بڑی کچھ لڑکیوں کو دوست سمجھتی تھی اور ان کی ذات کی پناہ میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پھر ایک دن سکول کے دو گروپوں کے درمیان لڑائی ہو گئی۔ دونوں گروپ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزیں سلیٹوں کے اوپر رکھ کے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ کہ لڑائی کے دوران ایک گروپ کی سلیٹ سے ایک ٹافی نیچے گر گئی جو اس دس سال کی بچی نے اٹھا لی۔ اس گروپ کی لیڈر نے دوسری گروپ کی لیڈر کو طعنہ دیا کہ وہ دیکھو تمہارے گروپ کی بھوکی لڑکی نے ہماری ٹافی اٹھا لی ہے۔ دوسری گروپ لیڈر کو ہتک محسوس ہوئی اس نے بڑی نفرت سے کہا۔ یہ بھوکی ہمارے گروپ کی تو نہیں ہے۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب رشتہ ٹوٹا تھا جب پناہ ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ بے سہارا ہو گئی تھی۔ اس کو یاد آیا۔ وہ دس سال کی ننھی سی بچی اپنا منہ اور ننھا سا پیٹ گرم دیوار کے ساتھ چپکائے زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا اور پہلے رشتے کے ٹوٹنے پہ، پہلی بار بے اماں ہونے پہ، ایک گرم دیوار نے اس کو سہارا دیا تھا۔ آج بھی اس کو سکول کی دیوار کی شفیق حدت یاد تھی۔

اجمیر چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر دیوار ڈھے گئی اور وہ تاریک خلا کی نذر ہو گئی۔

کتنے ہی دنوں تک ماحول پر ایک خوفناک خاموشی طاری رہی۔ دنیا میں تصادم روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ خودکُشیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ آج پھر اخبار میں بھوک کی وجہ سے خودکشی کی خبر نے چونکا سا دیا۔ یوں لگا جیسے اس شخص نے خودکشی کر کے زیادتی کی ہے۔ سسٹم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ پھر اس نے خواہ مخواہ خودکشی کر لی ہے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بھوک کی وجہ سے خودکشی کرے۔ وہ بھوکا رہے ہی کیوں؟ گھر سے باہر نکلو، قدم قدم پر فروٹ کی ریڑھیاں لگی ہیں۔ چپے چپے پہ ہوٹل ہیں۔ ڈھابے ہیں۔ کھوکھے ہیں۔ تنور ہیں۔ ہر روز روڈ کے اوپر ایک چمکتا دمکتا شاندار ہوٹل ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ آخر یہ ہوٹل راتوں رات کہاں سے آ جاتے

ہیں۔ زمین سے اُگتے ہیں یا آسمان سے برستے ہیں سڑکوں، بازاروں، گلیوں، چوراہوں کے اندر مخلوق کا ازدحام ہے۔ گاڑی کے ساتھ گاڑی لگی ہے، آخر یہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟ یہ کیوں متحرک ہیں؟ اگر یہ متحرک ہیں کہیں جاتے ہیں تو کسی کام سے جاتے ہوں گے۔ اور کام کوئی بھی ہو اس کا معاوضہ تو ہوتا ہے۔ اس حرکت سے تو یہی لگتا ہے۔ سارا معاشرہ متحرک ہے اور کچھ نہ کچھ کر رہا ہے پھر ایک شخص کی خودکشی کیوں؟ وہ شخص کیوں اس بہتے ہوئے ریلے کا حصہ نہ بنا۔ وہ کیوں تنہا ہوا؟ اور اس نے کیوں خود کو مار ڈالا؟

یہ اجتماعی انسانی لاشعور کی کارستانی ہے! نہیں! نہیں! انسانی لاشعور پر الزام لگا کر اس جرم سے نہیں بچا جا سکتا۔ وہ جُرم جو انسان کی خودکشی کا باعث ہے۔ وہ کیفیات جن کے ساتھ "بے" کا لفظ لگتا ہے اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بے معنویت، بے مقصدیت، بے اعتباریت کچھ انسانوں کی ترقی اور ہوس نے دوسرے انسانوں کی محرومیوں کو بڑھا دیا ہے۔ یہ اونچے ایوانوں والے کب چاہتے ہیں کہ نیچی جھونپڑی ختم ہو جائے۔ آخر اونچے ایوان کی شناخت نیچی جھونپڑی ہی تو ہے۔ ہم لفظوں کے تصور نہیں بدلیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ غربت کا لفظ ختم ہو جائے۔ جب شہر میں سارے گھر ایک جتنے بلند اور ایک جتنے کھلے ہوں۔ تو کوٹھی، بنگلہ، مکان، کٹیا کے تصور کہاں جائیں گے۔ لفظ ہی بے وقعت اور بے معنی ہو جائیں گے۔ جب ہر گھر کے کچن میں ایک جیسا کھانا پکنے لگے گا تو اختلاف، تنوع کہاں جائے گا۔ ذائقہ دربدر ہو جائے گا۔ یکساں ہو جائے گا۔ جب سارے شہر کی عورتیں ایک جتنے مہنگے لباس، زیورات پہننے لگیں گی تو خوبصورت اور بدصورت کے درمیان تمیز کہاں جائے گی۔ جب سارے طالب علم ایک جیسی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگیں گے تو افسروں کے ڈھیر لگ جائیں گے۔ مزدور کہاں جائے گا۔ مزدور کہاں سے آئے گا۔ انقلاب برابری کی سطح کا نام نہیں ہے، انقلاب نیچے کی زمین اوپر اور اوپر کی زمین نیچے کی طرف کر دینے کا نام ہے۔ لفظ ختم نہیں ہونے چاہییں۔

مسافر بس کے درمیان حبس اور بدبو سے بھرے جسموں کے درمیان بے بسی کے ساتھ کھڑے کھڑے اس نے اجمیر کو یاد کیا۔ اس کے پاس سفر کے لیے سواری بھی نہیں۔ شدید خودترسی کا احساس اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اس گندے، کراہت آمیز اور کربناک ماحول میں وہ اجمیر کو نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اجمیر اُس کی تنہائی کی پرسکون، پاک اور خوشبودار خلوتوں کا ساتھی تھا۔ اس کا تصور گدلا ہوتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو بے حد بے بس محسوس کیا اگر وہ اجمیر کی یاد کا سہارا نہیں لے گی تو

اس نا قابل برداشت ماحول کی گھٹن میں مر جائے گی۔ یہ درست ہے کہ وہ اس سے لاتعلق ہونا چاہتی ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ وہ اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ نہ جانے کیسی کیسی نا قابل برداشت کیفیتوں میں وہ اس کا سہارا بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت بھی یہی ہوا تھا، اجمیر کا خوبصورت بدن اس کے گرد حصار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے آفٹر شیو لوشن کی حیات بخش خوشبو اس نے ایک لمحے کے لیے محسوس کی اور گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے ہو گیا۔

روڈ پر اتر کر وہ پیدل کچے راستے پر ہو لی۔ اسے یاد آیا ایک دفعہ ابا جی نے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں پر راضی ہوتا ہے ان کو سواری دیتا ہے اور وہ پھٹ پڑی تھی۔

کیا اِن سارے بدمعاش حکمرانوں، زانی سیاست دانوں، چوروں، ٹھگوں، بدمعاشوں، راشیوں، ناحق کھانے والوں اور ''لمبی توند والے'' انسانوں کو لڑانے والے مولویوں پر اللہ راضی ہے کہ ہر ایک کو کئی کئی شاہانہ سواریاں دے رکھی ہیں۔ اور صرف مجھ سے ناراض ہے۔ میں زیادہ بڑی گناہ گار ہوں ناں۔ اور پھر اگلے ہی لمحے آنسو جیسے اس کی آنکھوں سے پھٹ پڑے۔ کہاں جائے کیا کرے؟ یہ دنیا کتنے بڑے دھوکے اور پروپیگنڈا کا شکار ہے۔ اللہ کو کس کس طریقے سے اپنے حق میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور اللہ ہے کہ ہر طریقے سے استعمال ہوتا جا رہا ہے۔ آخر کیوں اپنی رسی نہیں کھینچ لیتا اور پھر اس نے خود ہی اپنی سوچ کو ملامت کی اور گھر کی دہلیز پر قدم رکھ دیئے۔

اس کا بنایا ہوا شاہکار اچھے داموں بک گیا۔ اب وہ کسی نئے آئیڈیا کی تلاش کے لیے کچھ عرصہ آزاد تھی۔ ایک بہت بڑے صنعت کار کی ماں نے جو کہ ایک اور بہت بڑے صنعت کار بیوی بھی تھی وہ کولاج خریدا تھا۔ اسے زارا کی بات یاد آ گئی تھی اور خود کو مجرم تصور کرنے لگی۔ اس کا روزگار بھی تو ایک ایسی سرگرمی سے وابستہ ہے جو بقول زارا کے الم غلم اور فضول اشیاء کا ڈھیر ہے مگر معروضی انسانی مسائل کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کی بھی تو کوئی اہمیت ہے۔ زندگی میں صرف مادی مسائل ہی تو اہم نہیں۔ انسان کی کچھ حسی، نفسیاتی اور روحانی ضرورتیں بھی تو ہیں۔ اس نے خود کو بہلانا چاہا اور اپنے کمرے کے اندر جا کر ڈھیر ہو گئی۔

تمام دُکھ ہے

وہ بونوں کے شہر میں تنہا تھا۔

وہ سارے کے سارے اسکے اردگرد رہا کرتے۔ گھیرا ڈالے اس کے آس پاس، رقص کناں رہتے۔ اس کے بے حد قریب ہونے کی کوشش کرتے، مگر وہ ان کی گرفت میں کہاں آتا تھا۔ وہ بونوں کے شہر میں سب سے بلند قامت آدمی تھا۔ کتنی بڑی اذیت ہے ناں! جب آپ اپنی گردن کے مقابل کسی کی گردن نہ دیکھیں۔ جب آپ کی آنکھیں قائمۃ الزاویہ پر مقابل آنکھوں سے دوچار نہ ہوں۔ آدمی صحبت ناجنس کا شکار ہو جاتا ہے، جب اسے دیکھنے کیلئے سر کو نیچے تک جھکانا پڑے۔

وہ رات دن اس کے آس پاس رہا کرتے۔ اسے پالینے، پہچان لینے، کی جستجو میں سرگرداں رہتے۔ اس آگہی سے بہت دور، کہ وہ ان کی گرفت سے بہت پرے ہے۔ وہ ان کے ادراک کی حدوں سے بھی اونچا ہے۔ وہ اپنی سی کوشش کرتے رہتے۔ وہ اس کو جتنا اور جہاں تک دیکھتے یا محسوس کرتے اسے اتنا ہی سمجھتے۔ وہ تم نے اندھیرے میں چار اندھوں کے ہاتھوں سے ٹٹول کر ہاتھی کو دیکھنے کی کہاوت تو سنی ہے ناں۔

جس نے اس کو جتنا پایا، اس نے اس کو اتنا ہی جانا۔

کیا قوت باصرہ کے بغیر محض لامسہ اور قوت سامعہ کے ذریعے معرفت مکمل ہو سکتی ہے؟

وہ بہت قدآور تھا۔ بونوں کے شہر میں اونچا قد اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ وہ اس شہر کو چھوڑ کر کسی ایسی بستی جانا چاہتا تھا، جہاں لوگ اسکی قامت کے ہوں، مگر ایسا ہونا کہاں ممکن تھا۔ وہ جس بستی کا بھی رخ کرتا وہیں کے لوگ بونے ہو جاتے۔ ان کے قد گھٹنے لگتے، اور وہ جس بلندی پر ہوتا وہیں رہ جاتا اور ایک بار پھر صحبت ناجنس کا شکار ہو جاتا۔

اس کی گردن تک کبھی کوئی پہنچا ہی نہ تھا۔ اور تم تو جانتے ہو گردن کے اوپر سر ہوتا ہے۔ جب تک سر بہ سر ایک دوسرے کی دید نہ ہو شنید بھی نہیں ہوتی۔ ان میں سے کچھ اسے پاؤں تک جانتے تھے۔ کچھ گھٹنوں تک، اور کچھ ناف تک، اور ناف تک پہنچنے والوں کی معرفت وہیں مکمل ہو جاتی تھی۔ وہ اسے اس کے ''لنگ'' سے تعبیر کرتے۔ اور اس کی عجیب و غریب تاویلات کرتے۔ اس کو طرح طرح کے نام دیتے۔ اپنی اوقات تک اس پر تبصرے کرتے اور کھوکھلی ہنسی ہنستے۔ وہ ایڑھیاں اٹھا اٹھا کر اس کو دیکھتے، مگر ان کی بصارتیں پست ہو جاتیں۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی آوازوں کے ہتھوڑوں سے اسکی سماعت کو گراں بار کرنے کی کوشش کرتے، مگر ان کی آوازیں دب جاتیں۔ وہ ان کے سارے تبصروں سے بالا ہی بالا اپنی دھن میں رہتا تھا۔ وہ بصری، سمعی، حسی وجدانی ہر سطح پر بلند تھا۔

یہ بلندی اس کیلئے خوشی نہیں اذیت کی باعث تھی۔ آدمی کی سب سے بڑی دشمن اس کی اپنی دانش ہے۔ یہ دانش اس کو اکیلا اور تنہا کر دیتی ہے۔ وہ اگر اپنی ذہانت سے توقع کرے کہ وہ اس کو بہت سارے دوست دے گی، تو یہ اس کی سب سے بڑی خطا ہے۔ وہ خود کو بونوں کے برابر کیسے لاتا؟ وہ اپنے پاؤں، گھٹنے، حتی کہ پوری پوری ٹانگیں کولہوں سمیت کاٹ دیتا تو بھی اس کا سر بونوں کے سر کے برابر نہ ہو پاتا۔ اور جب تک سر بہ سر دید نہ ہو، شنید بھی نہ ہوتی۔

عمرانیات کے سارے اصول اس کے لیے فنا ہو گئے تھے۔ اس کے ہونٹ اپنے ہم جنسوں کی محبت کیلئے لرزتے۔ اس کی آواز کپکپا جاتی ۔اس کی بصارت اپنے مقابل آنکھیں ڈھونڈتی ،مگر نارسائی آڑے آجاتی۔ نیچے والے اوپر دیکھنے کی اذیت میں مبتلا ہوتے تھے اور وہ نیچے دیکھنے کی اذیت میں مبتلا تھا۔

وہ اتنا بلند ہی کیوں ہوا تھا؟ عمرانیات کا اصول ہے کہ لوگوں کے قد برابر ہوں تو ابلاغ ہوتا ہے۔ ابلاغ ہو تو ترسیل ہوتی ہے۔ ترسیل ہو تو زندگی جاری رہتی ہے۔ قد اونچ نیچ کا شکار ہوں تو معاشرہ عدم توازن کی نذر ہو جاتا ہے۔

مگر اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو قدرتی طور پر بلند قامت تھا۔ بونوں کے اور اس کے درمیان ابلاغ نہیں تھا، بلکہ ایک خلا تھا، اس خلا کے اندر تنہائی کی وحشت بھی تھی اور لاتعلقی کی نعمت بھی ۔آدمی کو وحشت تو ہوتی ہے جب وہ اپنی آنکھوں کے مقابل کسی کی آنکھیں نہ دیکھے۔ بونوں کی بستی میں رہنے والے کو اپنی تنہائی کے ساتھ جینے کی عادت ہو گئی تھی کہ ایک رات ایک عجیب حادثہ ہوا۔

ایک رات جب وہ سویا، تو کسی دوسری نیند کے اندر چلا گیا۔ اس کا بدن کسی نرم و ملائم سی،

نیم سیال نیم گرم، دلدل کے اندر دھنستا چلا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ حواس کی دنیا میں نہیں رہا۔ اس نے ہاتھ پاؤں نہیں مارے۔ قاتل دلدل نے اس کے حواس اور بدن کو مفلوج کر دیا تھا، مگر اسے لگا کہ اسے یہ بے بسی مرغوب تھی، اس کے بدن کو مطلوب تھی، اس کے وجدان کا مقصود تھی۔ دلدل نے چاروں اور اس کے بدن کو جکڑ لیا۔ جیسے وہ کوئی آکٹوپس ہو۔ یہ آکٹوپس اس تجریدیت کی ضد تھی، وہ تجریدیت جو اسکو بونوں کے شہر میں رہ کر حاصل ہوئی تھی۔ یہ دلدل ثنویت تھی۔ ''دوسرا وجود'' جو اس کے پورے بدن کے اردگرد کھال کی طرح لپٹ گیا تھا۔ ہو بہو اس کے اپنے بدن، اپنے قد کے برابر تھا۔ ایسا عین ممکن تھا۔ کیونکہ وہ دلدل کے کفن میں کسی لاش کی طرح پورا آیا ہوا تھا۔ اس انکشاف نے اس کے اندر سرور و بہجت کی ایک لہر بھر دی۔ اس کی تجریدیت پر کاری ضرب لگانے والی ثنویت، اس کے بدن اور قامت کے عین مطابق، ایک دوسرا بدن ــــــ ،اس خوش کن انکشاف کے بعد اس کے حواس نے بحال ہونا شروع کر دیا۔ وہ پورے حواس کے ساتھ دوسرے وجود کی مکمل شناخت چاہتا تھا۔ پہلے قوت لامسہ بیدار ہوئی۔ موجودگی کا احساس، ــــــ جسم کی مکمل ساخت کی پہچان، وہ اپنی جلد، انگلیوں کی پوروں، ہونٹوں کے لمس، بدن کے ایک ایک پور کے ساتھ اس کو یکجا کرتا رہا، مگر معرفت نہ ہو سکی ــــــ کیا محض قوت لامسہ کے ساتھ معرنت ممکن ہے؟

بونوں کی بستی میں رہنے والے شخص کی اذیت دوہری ہو گئی۔ (عدم معرفت) وہ دوطرفہ عدم معرنت کے شکنجے میں تھا۔ دوسرا وجود جو اس کے بدن پر کھال کی طرح منڈھا ہوا تھا، وہ اس کی معرفت چاہتا تھا مگر نہ ہو سکی ــــــ

تو اسے اس کی معرفت کیوں نہ ہو سکی؟

مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ اپنی ایک آنکھ بند کرو، دوسری کو پوری طرح کھولو، اب اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنی کھلی آنکھ کے اوپر رکھو اور ہاتھ کی لکیروں کو دیکھو۔ بتاؤ ہاتھ کی ہتھیلی میں کچھ نظر آیا؟

کیا نظر آیا؟؟؟

کچھ بھی نہیں ۔ہتھیلی نے بصارت کو بند کر دیا تھا۔ نظر کیا آتا ــــــ تو ثابت ہوا کہ زیادہ قربت بھی پہچان کو دھندلا کر دیتی ہے۔ بلکہ معرفت کو مٹا دیتی ہے۔ تم کہتے ہو دوئی نہ رہی۔ حالانکہ دوئی ہوتی ہے بس اس کی معرفت نہیں رہتی ۔دوسرا وجود جو دلدل کی طرح اس کے چاروں اور لپٹ گیا تھا وہ اس کی معرفت کیسے کرتا ــــــ

قوت لامسہ سے، قوت شامہ سے، قوت ملہمہ سے، محض تین حسوں کے ذریعے معرفت

ممکن ہوسکتی ہے کیا؟

قوت باصرہ،قوت سامعہ،قوت ذائقہ کے بغیر معرفت ممکن ہوسکتی ہے۔مگر مکمل نہیں ہوسکتی

—

ادھورے حواس کے ساتھ معرفت کا امکان تو ہے تکمیل نہیں۔تکمیل کیلئے چھے کی چھے حسیں ضروری ہیں اور ایک مناسب حد تک نظارے کی تکمیل ایک مناسب دوری کے بغیر ممکن نہیں۔بونوں کے شہر میں رہنے والا تنہا آدمی تجریدیت سے ثنویت کی طرف سفر کر کے دوبارہ تجریدیت کی طرف لوٹا تو اپنی ذات کا عارف ہوچکا تھا۔اور عرفان ذات وہ نشاط ہے، جس کے بعد سارے جھگڑے ختم ہوجاتے ہیں۔اب دوسرے وجود کی عدم معرفت، بونوں سے ناہمواری،عدم ابلاغ، بلندی کی اذیت، پستی کا احساس،سب ختم ہوگئے تھے۔سارے دکھ ہی اپنے وجود کی پہچان کے ہیں۔اور جب وجود کی پہچان ہوجائے تو ـــــ

وجود دکھ ہے وجود کی یہ نمود دکھ ہے
حیات دکھ ہے ممات دکھ ہے
یہ ساری موہوم و بے نشان کائنات دکھ ہے
شعور کیا ہے؟اک التزام وجود ہے
اور وجود کا یہ التزام دکھ ہے
یہ ہونا دکھ ہے نہ ہونا دکھ ہے
ثبات دکھ ہے دوام دکھ ہے
میرے عزیز وتمام دکھ ہے۔

یک بوسہ شیریں

چیخم دھاڑ کی آوازیں سن کر SHO محمود عباسی نے جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر باہر جھانکا۔اور سامنے کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ASI عمر افتخار ایک ملزم کو درخت کے ساتھ باندھے وحشیانہ طور پر پیٹ رہا تھا۔عمر افتخار کے ملزم کو پیٹنے کے انداز میں نہ جانے کیا تھا کہ محمود عباسی وہیں اکڑ کر رہ گیا۔

آنکھیں بند کیے، ماتھے پر بل ڈالے وہ دونوں بازوؤں کو سر کے اوپر سے گھما کر لے آتا کہ بازوؤں کی مچھلیاں پھول کر پھٹنے کو آجاتیں اور پیٹ اور اندر کی طرف پچک جاتا۔اور پھر سٹاک کے ساتھ ایک ضرب ملزم کی کمر پر پڑتی اور اس کی فلک شگاف چیخ بلند ہوتی۔

عمر نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ جیسے کان بھی بند کر لئے تھے اور آج کچھ کر گزرنے کے موڈ میں تھا۔کہ اچانک ہی اس کی سرگرمی میں خلل آگیا۔یکدم تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے اور چھتر بے اختیار اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔"عجیب وغریب" محمود عباسی نے بڑبڑاتے ہوئے منشی کو حکم دیا کہ عمر افتخار کو اس کے کمرے میں بھیجے اور خود دفتر میں جا کر بیٹھ گیا۔

سر ـــــ عمر کی تھکی ہوئی آواز پر وہ چونکا۔

آؤ عمر بیٹھو۔آج کافی کچھ حیرت انگیز ہوا ہے۔کافی سال سے تم فیلڈ میں ہو مگر غیر روایتی رویے کے ساتھ۔آج میں حیران ہوں کچھ روایتی سا انداز آگیا ہے تم میں۔یہ تبدیلی میری سمجھ سے باہر ہے۔تم سمجھ سکتے ہو ـــــ ملزم کو مارنا اور یکدم چھوڑ دینا، آئی مین کوئی مسئلہ ہے تو ڈسکس کر سکتے ہو۔ہم دوست ہیں مجھ پر اعتبار کر و یار۔یہ سب کچھ رزاق، منور، عبداللہ وغیرہ کرتے تو قطعاً حیرت نہ تھی مگر تم۔ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پولیس آفیسر ـــــ اور یہ سب ـــــ محمود عباسی اپنی کرسی سے اٹھ کر

چلتا چلتا اس کی کرسی کی پشت پر آ کر ٹھہر گیا۔

وقت کے بھاری لمحے خاموشی کی تہہ میں سرکتے رہے۔ عمر افتخار کسی ٹرانس میں بیٹھا رہا مگر بولا نہیں۔ چلو کوئی بات نہیں۔ محمود عباسی نے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ تم جا سکتے ہو مگر یاد رکھو آج شام کو کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے۔

عمر افتخار جانتا تھا کہ محمود کھانا اس کے ساتھ کیوں کھانا چاہتا ہے۔ وہ ایک اچھا ذمہ دار پولیس افسر تھا۔ فرض شناس بھی تھا۔ چند دن قبل عمر نے ایک مسئلہ بغیر کسی تشدد یا دھمکی کے حل کر دیا تھا جو گزشتہ کئی ماہ سے پولیس کو لاحل نظر آ رہا تھا۔

ہوا یوں کہ پولیس کو کئی مہینے پہلے ایک مخبر نے اطلاع دی۔ کہ فلاں جگہ پر خانہ بدوشوں کی جھگیوں میں ایک بوڑھی عورت ہیروئن فروخت کرتی ہے۔ پولیس نے کئی مرتبہ چھاپہ مارا۔ ہر مرتبہ بوڑھی عورت کی نوجوان بہو اور پانچ بچوں کے علاوہ پولیس کو کچھ نہ ملا ــــــ ہر دفعہ بوڑھی عورت کچھ اس طرح سے چکر چلاتی کہ پولیس کو بے بس کر کے رکھ دیتی ــــــ آخری بار جب مخبری ہوئی تو ASI عمر افتخار کو بھیجا گیا۔ عمر افتخار جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ہیروئن بھی تھی اور بوڑھی عورت بھی تھی ــــــ محمود عباسی حیران تھا کہ آخر عمر نے ایسا کون سا چکر چلایا ہے ــــــ اور آج اس پزل کے ساتھ ایک اور حیرت بھی مل گئی تھی۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ مگر دونوں نہیں تھے۔ شاید تینوں تھے۔ عمر افتخار کے سامنے SHO محمود عباسی بیٹھا تھا اور SHO محمود عباسی کے سامنے ASI عمر افتخار۔ شاید ایسا ہی ہو مگر شاید ایسا نہیں تھا۔ منتظر اور مشتاق محمود عباسی کے سامنے کھویا کھویا سا عمر افتخار تھا اور عمر افتخار کے سامنے وہ تھی۔

الٹی سیدھی بے ربط باتیں کرنے والی۔ وہ جو ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں ہلکے ڈمپل پڑتے تھے۔ اور تو کچھ خاص اس میں تھا نہیں۔ مگر پھر بھی وہ عام نہیں تھی۔ اس کی بے ربط، بے ترتیب باتوں میں بھی ایک سلجھاؤ ہوتا تھا۔ ہمیشہ ہر وقت پر اعتماد، اپنی فضول اور لایعنی باتوں پر اعتماد رکھنے والی۔

عمر افتخار کی ہر آن بدلتی کیفیات اور اتار چڑھاؤ کی ذمہ دار وہ تھی۔ وہ اس کی رازداری کو سالم رکھنا چاہتا تھا مگر SHO کی کریدتی ہوئی آنکھیں برمے کی طرح اس کے وجود کو چھید کر اب اس کی ہڈیوں کو بورا کرنے والی تھیں۔

وہ کہتی تھی اپنی زندگی کے ہر لمحے کو انجوائے کرو۔ جب تمہیں اپنی کسی ناکامی پر غصہ آئے تو

کسی مجرم کو پکڑو اور خوب مارو۔ تاکہ سارا غصہ باہر نکل جائے۔ اور اس مار پیٹ کے عمل کو بھی انجوائے کرو۔ اس سے لطف اٹھاؤ اور جب میں ہیروئن بیچنے والی بوڑھی عورت کے گھر چھاپہ مارنے گیا تو بوڑھی روپوش ہو چکی تھی، مگر اس کی نوجوان بہو اور بچے اس کی جھگی کے اندر رہ گئے تھے۔ اس سے قبل کہ میں بھی باقی پولیس والوں کی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹ جاتا یا نوجوان عورت کو پکڑ کر تھانے میں لے آتا۔ اس کے کہے یہ جملے میرے دماغ میں گونجنے لگے۔

اپنی زندگی کے ہر لمحے کو انجوائے کرو' میں اچانک پلٹا اور میں نے اپنے ساتھ اپنے ماتحتوں کو اور نوجوان عورت کے بچوں کو جھگی سے باہر بھیجا، تاکہ تخلیے میں بوڑھی عورت کی بہو سے کچھ سوال جواب کر سکوں۔ جب سب باہر چلے گئے اور جھگی کے اندر میں اور نوجوان عورت تنہا رہ گئے تو میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور عورت کی طرف پلٹا۔ وہ تو جیسے صدیوں سے اسی لمحے کی منتظر تھی۔ کٹی ہوئی ڈال کی طرح میری گود میں آ گری۔ میں نے اس کے ہونٹوں کا ایک بوسہ لیا تو اس نے فر فر سارا کچھ مجھے بتا دیا۔ اس کا شوہر یعنی بوڑھی عورت کا بیٹا چھے ماہ سے جیل میں تھا۔ اور بوڑھی عورت ہیروئن بیچ کر اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔

اس نے نہ صرف اپنی ساس کا ٹھکانہ بتا دیا بلکہ ہیروئن جو چھپا کر رکھی تھی وہ بھی نکال کر دے دی۔ میں نے تو بس لمحہ انجوائے کرنے کی غرض سے ــــــ وہ سب ــــــ مگر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت کو تھانے میں لا کر چاہے کتنا ہی تشدد کیوں نہ کرتا۔ وہ کبھی بھی نہ مانتی۔

اس کی اوٹ پٹانگ باتیں نہ جانے کہاں کہاں مجھے یاد آتی ہیں۔ وہ کہتی تھی۔ پولیس والے! چوروں اور ڈاکوؤں کو اور عورتوں کو تنگ کرنے والوں کو خوب زور زور سے مارا کرو۔ جب تم مار رہے ہو گے تو میں تصور کی آنکھ سے دیکھوں گی کہ ڈنڈے پر گرفت کی شدت سے تمہاری انگلیوں کے ناخنوں میں لہو سمٹ آیا ہے اور وہ جامنی پڑ گئے ہیں۔ تمہاری کلائیوں اور ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی ہیں۔ تمہارا چہرہ سرخ ہو گیا ہے اور سینے کے جھاڑ جھنگاڑ میں زلزلہ آ گیا ہے۔ اور اس کے بعد پتا ہے کہ میں کیا تصور کروں گی ــــــ؟ میں سوچوں گی۔ یہ ہاتھ جن کی رگیں ابھر آئی ہیں اور جن کے ناخن جامنی رنگ کے ہو گئے ہیں، جو اس وقت کسی مجرم کے بدن پر تشدد کر رہے ہیں، یہ ہاتھ کسی کے نازک کانوں کے خوبصورت بالے کو چھو کر محسوس بھی تو کر سکتے ہیں۔ ان کے اندر احساس کی ریشمی برقی لہریں بھی تو دوڑ سکتی ہیں۔ یہ کسی نازک بدن کو کسی دوسری انتہا پر جا کر چھو کر محسوس کر کے اس کے اندر سنسنی بھی تو دوڑا سکتے ہیں اور یہ چہرہ جس کا دوران خون سمٹ کر جس کو سرخ اور گرم کر رہا ہے، یہ گرمی

اور سرخی کسی دوسرے احساس کی وجہ سے بھی تو ہو سکتی ہے۔ کہ اپنے پاس سے آنے والے نرم سانسوں کو بھی پگھلا کر رکھ دے۔ اور یہ سینہ جو غصے اور طاقت کی شدت سے لرز رہا ہے۔ محبت کے نرم، لطیف اور مخمور جذبات سے بھی تو لرز سکتا ہے۔

اوہو عمر افتخار! کیا مجرم کا جسم اور محبوبہ کا بدن ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں؟ کیا دونوں ہی طاقت کے اخراج کا محض ایک ذریعہ ہیں۔ نہیں ناں ___ تو پھر اتنی مشابہت کیوں ہے؟؟؟

یہ Treatment کی دو انتہائیں ہیں۔ مجرم کا بدن شدت اور محبوبہ کا لطافت ___ مگر تمہاری حالت دونوں کی دفعہ ایک سی کیوں ___ ؟؟؟

معلوم نہیں سر! اب میں جب بھی تشدد کرنے لگتا ہوں تو کہیں بیچ میں وہ آجاتی ہے۔ میرے ہاتھ سے ڈنڈہ سرک جاتا ہے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اور ہاتھ کسی نازک کان کے خوبصورت بالے کو چھونے کی آرزو میں دہکنے لگتے ہیں۔ چہرہ کسی قربت سے اٹھنے والی آنچ سے سلگنے لگتا ہے۔ اور میرے لہو کے کروڑ ہا خلیوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں ہم انسان نہیں ہیں۔ ہمارے نام کے ساتھ صحافی حضرات وحشیانہ، بہیمانہ، جیسے نامعقول الفاظ چسپاں کرتے ہیں۔ مائیں بچوں کو ہمارے نام لے لے کر ڈراتی ہیں۔ مگر لوگ نہیں جانتے کہ ان کے درمیان وہ بھی رہتی ہے۔ جو ہمارے تشدد کرتے جسموں اور بگڑے ہوئے چہروں کے اندر سے بھی حسن اور احساس تلاش لیتی ہے۔

کیا اب تک کی گزری ہوئی انسانی تاریخ میں مجھ سے پہلے بھی مجھ جیسی ذہنی اور جسمانی طور پر بھرپور عورتیں ناقابل یقین حد تک تکلیف دہ ذہنی اذیتوں سے گزاری جاتی رہی ہیں۔ اس مفروضے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً ہوگا اپنی اپنی سطح پر اپنے اپنے دور کا ہر اوچھا ہتھکنڈہ اور وار آزمایا جاتا رہا ہوگا۔ عورت نفسیاتی اور جسمانی سطح پر کتنی ہی مکمل اور بھرپور کیوں نہ ہو، جب تک معاشرے کے مروجہ اور عام منافقانہ انداز مکمل طور پر نہیں سیکھ جاتی وہ آزمائی جاتی رہے گی۔ کیا میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں نہیں ابلاغ ہو سکتا تا کہ ایک کولاج بن جائے۔ اب تک کتنی مشکل کے ساتھ میں نے اپنی شخصیت کی بے ربطگی کو مربوط اور بے ضابطگی کو منضبط رکھا ہوا ہے۔ اپنے قول فعل میں ہمیشہ میں جس عدم توازن کی مظہر رہی ہوں تحریر میں کیوں نہیں ہو سکتی۔

''وہ کہتے ہیں'' لفظوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرو۔ لفظ بڑے منتقم مزاج ہوتے ہیں۔ یہ

انتقام بھی لیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جگہ بد احتیاطی سے استعمال کیے گئے تمہارے لفظ گلے کا پھندہ بن جائیں اور میں کچھ بھی بے احتیاطی سے استعمال نہیں کرتی ___ ہاں۔ مگر لفظ ___

سوچ کدھر بھٹکتی ہے ___ جدھر بھی ___ بھٹکنے دو۔

سوچ کی آوارگی کیا آوارگی نہیں ہے ___ نہیں ہے۔

گوتم بدھ کے سنگی مجسمے کے سامنے کنول آسن بٹھائے وہ مراقبے کی کسی کڑی خود احتسابی منزل سے گزر رہی تھی کہ اسے کندھے پر کسی کی انگلیوں کی گرفت کا احساس ہوا۔ آنکھیں کھولے بغیر ہی اس نے جان لینا چاہا کہ کون ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا وہی دوست ہے۔ جو ایک ادھورا اور ان کھلا منافق ہے۔ تم چلو میں آتی ہوں۔

اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ سامنے بیٹھے گوتم کو دیکھا۔ گوتم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کسی مشابہت سے اس کے وجدان نے ٹھوکر کھائی۔ گوتم کے موٹے موٹے ہونٹوں کی مشابہت سے اس کے وجدان نے ٹھوکر کھائی۔ گوتم کے ہونٹوں کی مشابہت اور مسکراہٹ ___ وہ حال کا لمحہ اور ماضی کا کوئی لمحہ ___ مل کر ایک دم حال کے لمحے کی کوکھ میں اترے۔ کیا سارے زمانے یکجا ہو سکتے ہیں۔؟ ہو بھی سکتے ہیں۔ بلکہ ہو رہے ہیں۔ گوتم کے موٹے موٹے ہونٹ ___ مسکراہٹ ___ یہ سب کہیں غلط ملط ہو رہے ہیں ایک پیکر اس کے اندر ڈھلتا ہے سماتا ہے اور پھر نکلتا ہے ___ وہ ایک منٹ کا شاید دسواں حصہ تھا۔ جب اس کی ساری حسیں ایک ہی نقطے پر یکسو ہو گئی تھیں۔ احساس کی نرم چادر پورے بدن کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

گوتم اب اسے گھور کر دیکھ رہا ہے۔ آنکھ میں شناسائی کا چکر ہے۔ وہ آنکھ چرا جاتی ہے۔ کنول آسن ڈاٹے گوتم کے آسن کے وسط میں جاتا اس کا دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے ازمیر کی اور اس کی لڑائی اور جنگ وجدال۔

یونہی بیٹھے بٹھائے ___ ''گوتم بدھ'' اسلم انصاری'' کی نظم ''تمام دکھ ہے'' سے بات چل نکلی تھی۔

یار کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ___ گوتم بدھ inpotent تھا۔

کیا مطلب؟؟؟ وہ حیران ہوئی مگر اس کی بیوی ''یشودھرا'' اور بچہ ___ کیا سمجھتے ہو تم کہ

نہیں نہیں یار۔ دیکھو یوں بارہ سال تک ایک ہی آسن میں بیٹھے رہنا I Think Not کہ

کوئی نارمل مرد بیٹھ سکتا ہو ـــــ وہ کچھ الجھ سا گیا میں اکثر سوچتا ہوں۔

وہ نارمل مرد تھا کب؟ وہ ایک غیر معمولی مرد تھا۔ اور اس کا کمال یہی تھا کہ وہ ایک نوجوان بیوی اور بچے کو چھوڑ کر آیا۔ پوری قوت ارادی کے ساتھ بیٹھا رہا اور جب نجات پا گیا تو پھر انہیں لوگوں کی طرف، اسی بھرپور زندگی کی طرف لوٹ گیا۔ کیا یہ ہجرت اور مراجعت تمہیں ایک عام سی چیز لگتی ہے؟؟؟

ہجرت اور مراجعت نہیں معراج کہو یار ـــــ یہ اس کی معراج تھی ہاں اور اگر تمہاری بات مان لی جائے تو ایک بہت بڑے thesis کا Anti thesis ہو جاتا ہے۔ وہ اگر Inpotent تھا۔ پھر تو اس کی ساری سرگرمی اور ریاضت ایک عام آدمی کی سرگرمی ہوگئی۔ اس میں خاص تو کچھ رہا نہیں پھر۔

اور اس thesis کا Anti thesis نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارے جیسے سرپھروں کو اخلاقاً قانوناً کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کروڑوں لوگوں کی عقیدت کا مذاق اڑائیں۔

گوتم بدھ کے ہونٹ اور مسکراہٹ ـــــ وہ پوری آنکھیں کھول کر ماضی کے اس لمحے کی گرفت کو حال میں کھینچ لائی ـــــ آوازوں پر آوازیں پڑ رہی تھیں۔ تلملا کر اس نے دیکھا۔ پورا تعلیمی یونٹ اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

کم بخت ایک تو یہ لوگ جان نہیں چھوڑتے۔ آدمی اس دنیا میں تنہا کیوں نہیں ہے۔؟

کھانے کی بے ڈھنگی کوشش کے دوران اس نے سامنے بیٹھے بلال سے سوال کیا۔

کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ماضی کا کوئی گزرا ہوا لمحہ حال کے لمحے میں آ کر پیوست ہو جائے اور کسی زندہ انسان کی شبیہہ کسی معروف مذہبی نمائندہ مجسمے کے اندر سما جائے۔

ہاں ہو سکتا ہے۔ تمہیں دن دیہاڑے التباس نظر ہو رہا ہے۔

نہیں۔ نہیں تو ـــــ تم میری ذہنی اذیت کے مرحلہ وار اسباب کو تو جانتے ہو ناں؟؟ وہ پورا سیناریو تمہارے سامنے ہے۔ ایک Situation تمہیں دیتی ہوں ذرا غور کرنا ـــــ

میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھے پکڑے اور انہیں بھی (میرے محبوب کو) ـــــ اور ہم دونوں کو کسی وسیع و عریض پھٹے پر رکھ کر ہم دونوں کا قیمہ بنا کر آپس میں یوں ملا دے جیسے گندم کے دانوں کی انفرادیت پسے ہوئے آٹے کی اجتماعیت میں بدل جاتی ہے۔ اور میری اس انتہائی شدید خواہش کا پتا اگر میرے دشمن (رقیب) کو لگے تو سوچو اس کی کیا حالت ہو۔

اس بے چارے کے جذبۂ انتقام کی تو ماں ـــــ بلال نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

عمر افتخار ـــــ ایک پڑھا لکھا نوجوان پولیس آفیسر، تشدد کی بجائے مذاکرات پر یقین رکھنے والا۔ بودا بچہ نہ جانے کچھ عرصے سے اتنا تشدد پسند کیسے ہو گیا ہے۔ عجیب و غریب بات تھی محبت انسان کو تشدد پسند بھی بنا سکتی ہے۔ شام کے کھانے کے بعد محمود عباسی ابھی تک کھانے کی میز پر بیٹھا تھا اور مسلسل اس ان دیکھی لڑکی کو سوچے جا رہا تھا۔ عابد سپاہی نے کئی بار کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا مگر ہر بار اس کو خاموشی سے سوچوں میں گم سگریٹ کے کش لگاتے دیکھ کر چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔ لگتا ہے صاحب کے پاس کوئی مشکل کیس آ گیا ہے۔ عابد جانے کیوں بار بار صاحب کا دروازہ کھول بند کر رہا ہے سپاہی شبیر نے سوچا۔ سوچ کیسے ایک فرد سے دوسرے فرد تک سفر کرتی ہے۔ سوچ کے اندر کتنے امکانات ہیں کتنے گمان ہیں۔ عمر افتخار اس کو سوچتا ہے۔ محمود عباسی، عمر افتخار کو سوچتا ہے، محمود عباسی کو عابد سپاہی اور عابد سپاہی کو شبیر سپاہی بھی سوچتا ہے شبیر سپاہی کو بھی کوئی سوچتا ہوگا ـــــ امکانات کا سلسلہ لامحدود ہے۔

وہ لڑکی عمر افتخار کی ان نفسیاتی وجوہات کی محرک ہے۔ یہ بے وقوف اس سے محبت کرنے لگا ہے اور وہ اس کی محبت کو تسلیم نہیں کرتی۔ تبھی اتنی آزادی سے اس کے ساتھ آزادانہ بک بک جھک جھک کرتی رہتی ہے۔ اور یہ بے وقوف سیریس ہوتا رہتا ہے۔ میں اس کو سمجھاؤں گا۔ ہاں ضرور سمجھاؤں گا اور پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر وہ یکدم مطمئن ہو کر بستر پر چلا گیا۔

آج ان کے تعلیمی دورے کا آخری دن تھا۔ وہ آخری مرتبہ گوتم بدھ کے اس سنگی مجسمے کے سامنے بیٹھ کر سیمیائی طلسم دیکھنا چاہتی تھی تا کہ کسی کے پیکر کو گوتم کے مجسمے میں ڈھلتے اور پھر نکلتے دیکھ سکے۔ اور اس لمحے میں گوتم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں کی رسالت میں قید کرے۔ کہ اتنے میں موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ عمر افتخار کا فون تھا۔ کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟

پہاڑوں میں ہوں ـــــ پوجا پاٹھ کر رہی ہوں ـــــ تم سناؤ؟

ہاں بس ٹھیک۔ تمہیں ایک واقعہ سنانے کے لئے فون کیا ہے۔

تو سناؤ۔

بدصورتیوں میں سے خوبصورتیاں تلاش کرنا، پہاڑوں کے اندر جھرنے ڈھونڈنا، مٹی کی

گہری تہوں سے سونا اور ہیرے تلاشنا اور سنگی مجسموں کے اندر روح لپکنے کے انتظار میں رہنا تمہارا مشغلہ ہے ناں۔ وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا جیسے دکھی بھی ہو اور طنز بھی کر رہا ہو۔

ہاں ـــــ اس نے مختصر جواب دیا۔

تتلی کو پکڑ کر بچے کیوں مسل ڈالتے ہیں؟ پھول کو توڑ کر مرجھانے کیلیئے کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عورت کے بدن کا سب سے خوبصورت، نازک اور لطیف حصہ اس کے ساتھ تم مرد لوگ کیا سلوک کرتے ہو؟ کیا یہ ساری حسین ، نازک اور لطیف اشیاء اتنے ظالمانہ سلوک کی حقدار ہیں؟؟ یہ سب سوال تمہارے قائم کردہ ہیں ناں؟؟

ہاں ـــــ اس نے پھر اقرار کیا

تم ہی کہا کرتی تھیں۔ تشدد کے اندر سے حظ کشید کرو۔ ہر چیز سے لطف اٹھاؤ۔ تم خود تو جو بھی ہو جیسی ہو۔ ٹھیک ہو۔ مگر مجھے تو ایسا نہ بناتی تمہیں معلوم بھی تھا میرا فیلڈ اور ہے۔ میرے مسائل اور ہیں۔

ہوا کیا ہے؟ عمر افتخار تم اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ وہ پریشان ہوگئی۔

اس لئے بتا رہا ہوں کہ آئندہ تم کسی کو اس کے فریم سے باہر نکالنے کے جرم کا ارتکاب نہ کرو۔ تم نہیں جانتیں میں نے آج تشدد کر کے ایک مجرم کو Expire کردیا ہے۔ اور اب 302 کے کیس میں جیل جانے والا ہوں۔

یونٹ کے لوگ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے گوتم بدھ کے مجسمے کے پاس آئے تو وہ گوتم بدھ کے بازوؤں میں گری پڑی تھی۔ قریب ہی اس کے بائیں ہاتھ کے نیچے اس کا موبائل فون بکھرا پڑا تھا۔

وجود

کیا میں زندہ ہوں ، وجود رکھتی ہوں، موجود ہوں؟

نہیں نہیں میں موجود نہیں ہوں، میں صرف ماضی، حال اور مستقبل کے ربط کے ساتھ تن تنہا موجود کیسے ہو سکتی ہوں، میں کھو چکی ہوں کہیں ، میں نے ماریہ پر نظر ڈالی وہ موجود تھی مگر میں نہیں تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کو آواز دی !۔ ماریہ

ہوں! کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا ، ماریہ کیا میں تمہیں نظر آ رہی ہوں؟ ہاں ہاں تم موجود ہو مجھے نظر آ رہی ہو۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، تمہیں کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھار! وہ فکر مندی کے انداز میں بولتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور میرے پاس بیٹھ کر اپنا بازو میرے کندھے پر رکھ کر تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

کچھ بھی نہیں۔ میں نے اس کو مطمئن کرنا چاہا۔ مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی۔ مسلسل فکر مندی سے مجھے دیکھے گئی۔ ماریہ مجھے لگتا ہے میں کھو چکی ہوں۔

مگر کیوں! کیوں اس طرح لگتا ہے تمہیں! اب کے وہ جھنجھلا گئی۔

دیکھو ماریہ! میں اٹھ کر الماری تک گئی۔ اپنے تمام افسانوں، شاعری اور کالموں کا پلندہ نکال کر اس کے آگے پھینکا۔ دیکھو ان کو۔ مگر وہ اب بھی میری طرف متوجہ تھی۔ ہاسٹل کے اس کمرے میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی ساتھی تھیں وہ میری بہت اچھی رفیق تھی۔

دیکھو ان کی طرف۔ میں ہذیانی انداز میں چلائی۔ ماریہ نے بے بسی سے ان کاغذات کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر یہ افسانے تخلیق کئے تھے۔ یہ شاعری اور کالم لکھے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اپنی کم حیثیت کے باوجود میں نے اپنی ضروریات روک کر یہ افسانے اور کالم مختلف اخبارات کو ارسال کئے تھے۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں کتنی مشکلوں سے ہر ہفتے کا

اخبار خریدتی تھی۔ تاکہ اس میں شائع ہونے والا اپنا افسانہ دیکھ سکوں۔ لیکن ہر نیا رسالہ میری رہی سہی اُمیدیں بھی توڑ دیتا تھا۔ ماریہ افسانوں اور کالموں کے اس ڈھیر کے پاس بے حس و حرکت بیٹھی تھی اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

ماریہ! میں نے اسے پکارا تو اس نے گہری افسردہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش رہی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

اب بھی تم کہتی ہوں میں موجود ہوں۔ مجھے میرے وجود کا احساس دلاتی ہو؟ دیکھو! یہ لوگ زندہ ہیں، موجود ہیں جن کے الفاظ اس رسالے کے اندر جگمگا رہے ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ دیکھو اور میرا ذخیرہ الفاظ دیکھو۔ کیا یہ سب کچھ ایک جیسا نہیں ہے؟ میں نے رسالہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور اس نے خاموشی کے ساتھ پکڑ لیا۔ جب سب کے لفظ ایک سے ہیں تو پھر کیوں میرے لفظ اتنے بے مول اور بے حیثیت ہیں ماریہ کہ ان کو کبھی نمائندگی نہیں ملی؟

ماریہ چپ تھی۔ رسالہ اس کے ہاتھوں میں کپکپا رہا تھا۔ اور نگاہوں میں گہری اداسی اور سوچ تھی۔ شاید وہ بحث کر کے تھک گئی تھی۔ جب وہ کچھ بھی نہیں بولی تو میری آواز سرگوشیوں میں بدل گئی۔

میرے لفظ اس لئے بے حیثیت ہیں کہ میرا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ کوئی نام نہیں ہے۔ یہ دنیا بڑی عجیب ہے یہاں نام بکتا ہے۔ شخصیت بکتی ہے۔ جاوید چوہدری ایک کالم کا اتنا بھاری معاوضہ اس لئے لے رہا ہے اس کا ایک وجود ہے ایک ٹھوس اور مستند وجود۔ اس لئے اس کے لفظوں کا بھی وجود ہے اور لفظ بھی انہی کے وجود میں آتے ہیں جن کے وجود سے پیسہ وجود میں آئے۔

ڈیم اٹ! وجود! وجود! وجود ماریہ پھٹ پڑی۔

جاوید چوہدری نے اپنا وجود خود بنایا ہے کبھی وہ بھی تمہاری طرح معدوم ہوگا۔ نہ جانے اس نے کتنی محنت کی ہوگی خود کو عدم سے وجود میں لانے کیلئے۔ یہ نہیں سوچتی تم۔ آج اس کی شخصیت ہے۔ اس کا نام ہے۔ اس کے لفظوں کی وقعت ہے تم کیا ہو؟ ایک بے نام لڑکی جس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔ پھر تمہارے لفظوں کی کیا وقعت ہے؟ تمہارے کالموں یا افسانوں کے چھپنے سے کونسا اخبارات اور رسائل کی Circulation بڑھ جانی ہے۔ اپنی حیثیت پہچانو اور اوقات میں رہو۔ اچھی طرح ڈانٹ چکنے کے بعد وہ واش روم میں گھس گئی۔

میں نے اپنی حیثیت ہی تو پہچانی ہے خود کو ہونے نہ ہونے کے معیار پر پرکھا ہے اور اس

نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میں بے وجود لڑکی ہوں۔ میری ذات ہوتی تو میرا نام ہوتا۔ میرا نام ہوتا تو میرے لفظوں کا بھی کوئی وجود ہوتا۔ ان کی حیثیت ہوتی کوئی قیمت ہوتی۔

وہ واش روم سے باہر آئی اور میرے کاغذات کے بکھرے ہوئے ڈھیر کو سمیٹنے لگ گئی۔ پھر نہ جانے کس خیال کے تحت رکی اور سیدھی ہو کر میری طرف دیکھنے لگ گئی۔

دیکھو مدح! مجھے تمہاری بات کی سمجھ آ گئی ہے واقعی لفظ شخصیت کے ساتھ شناخت پاتے ہیں ورنہ ان کی اپنی حیثیت بھی کھو جاتی ہے۔ یہی لفظ ہوتے ہیں جب کسی مشہور آدمی کے قلم سے ترتیب پاتے ہیں تو انتہائی انمول ہو جاتے ہیں اور جب کسی گمنام کے ہاتھوں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتے ہیں تو اپنی شناخت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ انہیں بھی سجنے سنورنے کیلئے ہنر مند ہاتھوں اور زرخیز دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنجر ذہنوں میں اُگنے والے لفظ بھی جھاڑ جھنگاڑ کی مانند ہوتے ہیں اور بے ہنر ہاتھوں سے لکھے گئے لفظ موتیوں کی ٹوٹ کر بکھری ہوئی لڑی کی طرح۔ اس کے لہجے میں نرمی تھی اور آنکھوں میں محبت۔ وہ بڑے جذب کے عالم میں بولتی جا رہی تھی۔

اور سنو! جس طرح جڑے ہوئے خوبصورت موتی، مالا اور طرح طرح کے ڈیزائنوں کو جنم دیتے ہیں اور ہم ان ڈیزائنوں کو بڑی چاہ کے ساتھ خرید کر لاتے ہیں۔ یہی حال لفظوں کا بھی ہے۔ لفظوں کو ہنر سے سجا سنوار کر کوئی بھی شاہکار تخلیق کیا جا سکتا ہے میری جان! تم بے وجود نہیں ہو۔ اور نہ ہی تمہارے لفظوں نے اپنی شناخت کھوئی ہے۔ صرف تمہارا ہنر بازیافت نہیں ہوا۔ تمہیں خود کو ڈھونڈنا ہے۔ اس کے بعد اپنے لفظوں کو خوبصورت ڈیزائن دینے ہیں۔ انہیں خوبصورت مرقعوں میں ڈھالو گی تو یہ جی اٹھیں گے اور جب تمہارے لفظ جی اٹھیں گے تو تم بھی وجود میں آ جاؤ گی۔

وہ بالکل کسی مفکر کی طرح لگ رہی تھی میرے کندھوں کو چھوڑ کر دوبارہ کاغذات کی طرف متوجہ ہو گئی اور انہیں اٹھا کر بڑی محبت سے الماری میں رکھنے لگی۔

مدح! کوئی بھی لفظوں کا کھلاڑی لفظوں کی امامت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ اس کی شناخت ہوا کرتے ہیں۔ ہر مشہور شاعر، ادیب اور مفکر پہلے الفاظ کی تلاش کرتا ہے، ان کو مجسم کرتا ہے اور پھر خود زندہ ہو جاتا ہے۔ وہ لفظوں کو حیات دیتا ہے تو لفظ اس کی حیات بن جاتے ہیں۔ یاد رکھنا میری جان! شخصیت کے مفقود ہونے سے لفظ نہیں کھوتے جو تم سمجھتی ہو بلکہ لفظوں کی عدم بازیابی سے شخصیت کھو جاتی ہے۔ اپنی موت آپ مر جاتی ہے اور تم تو ابھی زندہ ہو۔ کاغذ قلم اٹھاؤ اور اپنے لفظوں کے کفن پھاڑ ڈالو۔ اس نے ڈائری اور پینسل اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھمائی اور خود کچن کے اندر غائب ہو گئی۔

قیدی

چھے وردیاں، چھے یونیفارم، چھے طرح کے رقص، چھے اقسام کی پرفارمنس، چھے طرح کے رنگ، چھے طرح کے روپ، چھے قسم کے سوانگ اور بہروپ وہ چھے کی اذیت میں مبتلا تھا۔

وہ چھے پھیروں اور چھے چکروں میں آیا ہوا تھا ہر چکر کا روپ جدا تھا نوعیت الگ تھی وہ چھے خانوں میں بٹ چکا تھا ہر خانے میں جانا بھی ضروری تھا اور ہر خانے کی پرفارمنس بھی الگ تھی ہر خانے کی وردی بھی الگ تھی اور سوانگ الگ تھا۔

ہر سوانگ، ہر وردی اور ہر روپ پر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔

پہلا خانہ باپ کا تھا دوسرا ماں کا، تیسرا بڑے بھائی کا، چوتھا بڑی بہن کا پانچواں منجھلی بہن کا اور چھٹا چھوٹی بہن کا صرف وہ تھا جس کا کوئی خانہ نہیں تھا وہ خانوں کی قید سے آزاد تھا۔

ہر خانے کا یونیفارم، ادب آداب اور طور طریقے اس کو ازبر تھے وہ کبھی بھی کسی دائرے کے اندر جاتے ہوئے ان ادب آداب، طور طریقوں اور روپ بہروپ کو نہیں بھولتا تھا پھر بھی اسے محسوس ہوتا کہ شاید وہ کوئی بے ضابطگی کر رہا ہے وہ کسی قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے یا پھر شاید ہر دائرے کے اندر جانے کیلئے اس کے پاس لگے بندھے لفظوں اور جملوں کی جو لسٹ ہے اس میں کوئی ہیر پھیر ہو گیا ہے شاید وہ مقرر کردہ لفظوں اور جملوں کی حدود سے تجاوز کرنے لگا ہے کیونکہ کچھ عرصہ سے اس کو محسوس ہوتا تھا کہ دائروں کے اندر رہنے والے لوگ اس سے کچھ نالاں ہیں اس سے راضی نہیں اور اس کی بے ضابطگیوں پر انگلی اٹھاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ انسانی جون میں آ رہا ہے اور پھر ایک شام یوں ہوا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔

شام کے وقت جب چند جملوں کا تبادلہ اس کے اور اس کی ماں اور بڑے بھائی کے

درمیان ہوا تو روٹی کا پانچواں نوالہ اس کے حلق میں پتھر کا ہو گیا۔ تھک ہار کر گھر پہنچنے والے کا احتجاج صرف اس بات پر تھا کہ بے شک اس پر اخلاقی جرائم کے الزامات لگائے جائیں کہ وہ گھر سے شہر کالج میں پڑھنے نہیں جاتا بلکہ شہر میں آوارہ گھوم پھر کر آ جاتا ہے یہ سب بجا سہی مگر اس کو کھانا کھانے دیا جائے کیونکہ وہ دن بھر کا بھوکا ہے۔

مگر وسوسوں اور وہموں میں مبتلا کھوکھلے دانشور مسلسل ماں اور بڑے بھائی کے روپ میں اس کی ذات کی دھجیاں بڑے وقار کے ساتھ اڑاتے رہے روٹی کا پانچواں نوالہ اس کے حلق میں پتھر کا ہو گیا جس کو وہ نہ نگل سکا اور نہ اگل سکا اور اس کی موت واقع ہو گئی موت جس پر قتل کا الزام بھی نہیں آتا پہلے اس سے گویائی چھینی گئی لفظ جن کو وہ بولنا چاہتا تھا حلق کے اندر اٹک کر رہ گئے اور وہ لفظ جن کو وہ بول سکتا تھا ان کو بولنا اس کے نزدیک بے معنی اور بلا جواز تھا کہ اس طرح کے کروڑوں لفظ روزانہ کروڑوں لوگ بولتے ہیں اس کی ماں، بہن ہر ایک اپنے اپنے خانے کے اندر قید تھے اور بہت مزے میں تھے۔

لگے بندھے لفظوں اور جملوں کی وہ لسٹیں جو اس کو باسہولت ابلاغ کے لیے جاری کی گئی تھیں وہ لپیٹ لی گئیں موت جو کہ چھے سمتوں سے اس پر وارد ہو رہی تھی پہلے ماں کے دائرے میں سے اس پر داخل ہوئی ماں کیلئے بولے جانے والے لفظوں کو چھین لیا گیا اور وہ لفظ جو اس کے اپنے تھے جن کو وہ بول سکتا تھا ان کو ماں کے یہاں کوئی قبولیت نہ ملی کیونکہ اس کے ذاتی لفظوں کی گونج اور ماں کی سماعت کے درمیان پتھر کی دیوار تھی گویائی یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے تمام دائروں سے چھینی گئی تو اس کے وجود کے چھٹے حصے کی موت واقع ہو گئی اور اس کے اور اس کے چھے کائناتی دائروں کے درمیان ایک خلا آ گیا گویائی کی موت کے بعد اس کی سنوائی مصلوب ہو گئی نہ بول سکنے کی اذیت میں مبتلا فرد آخر کب تک سن سکتا ہے نہیں جس کے پاس گویائی ہو وہ زیادہ عرصہ تک محض سنوائی کا آزار نہیں اٹھا سکتا سنوائی کی موت کے بعد اس کے سارے روپ بہروپ مرتے گئے۔

دائروں کے محبوس زندہ تھے چھے کے چھے دائرے زندہ تھے اپنے رسم و رواج اپنے طور اطوار، اپنے ادب آداب سمیت زندہ تھے اور وہ جس نے ان دائروں کی قید قبول نہ کی تھی آزاد ہونے کے جرم میں چھے سمتوں سے مارا گیا تھا۔ وہ اسی شام مر گیا تھا جس شام اس نے مقرر کردہ لفظوں کی فہرست سے تجاوز کیا تھا۔

یہ زمیں چپ ہے

وہ کسی کو کچھ نہیں بتا رہی تھی۔

گھر میں موجود سبھی افراد حق دق تھے ۔ چپ چاپ سینوں کے اندر بھانبڑ مچاتے اضطراب کو دبائے پپڑی زدہ ہونٹوں کے ساتھ زرد چہرے لئے لاشیں چل پھر رہی تھیں۔ بوا خانم کے سینے سے ایک دم ہچکی نما ہوکا نکلتا اور تخت پہ بیٹھی بیٹھی ایک جھٹکا لے کر بے دم ہو جاتیں اور اس کے بعد آنسو جو جھر جھر بہتے تو رکنے کا نام نہ لیتے۔

ابا جی یکسر خاموش تھے۔ بڑے اعتماد سے تسبیح کے دانے گراتی انگلیاں اب کانپنے لگی تھیں امی تو بس حالتِ نوم میں تھیں۔ جاگی ہوئی یا ہوش میں لگتی ہی نہیں تھیں مگر مسلسل روٹیاں بنائے جا رہی تھیں۔ اس کا بیگ ابھی تک برآمدے کی آخری سیڑھی پر ستون کے ساتھ پڑا تھا۔ خالد کی بے وقت موت کے بعد ایک ماہ کے اندر اندر ہی یہ اس خاندان کیلئے دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔

مین گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی میں نے اشرف سے پوچھا کہ خیریت تو ہے حالاں کہ مجھے گھر کے چوکیدار سے اس طرح کی بات اخلاقاً کرنی نہیں چاہیے تھی مگر گھبراہٹ اور بے بسی نے مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ تو ابھی ابھی اپنے گاؤں سے ہو کے واپس ڈیوٹی پر لوٹا ہے۔ فی الحال تو خیر ہے اس کی آمد سے قبل یہاں کچھ ہوا ہو تو اسے نہیں معلوم۔ میں نے اس کی بات کو درمیان میں ہی چھوڑا اور قدم آگے کی طرف بڑھا دیئے۔

برآمدے کے تخت پہ بیٹھی بوا خانم بے دم ہو رہی تھیں ۔ بھاری جسم جو سیاہ لباس کے اندر بڑا مقدس لگتا تھا ،گریہ کی وجہ سے ہلکورے لے رہا تھا۔ ابا جی کی کپکپاتی انگلیوں پر نظر ڈالنے کے بعد

نگاہ نے ان کے چہرے کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے اس ماتم کدے کی وحشت سے گھبرا کر ذرا آگے ہو کر کچن کے کھلے دروازے سے گردن لمبی کر کے جھاتی ڈالی۔ امی مُندی مُندی آنکھوں کے ساتھ روٹیاں بنائے جا رہی تھیں ۔ ایسے جیسے روزِ ازل سے اسی کام کیلئے پیدا کی گئی ہوں۔

ہاں تو یہ غلط بھی کب ہے ؟عورت اور پیدا ہی کس لئے ہوتی ہے۔ خدمت کرنے، برداشت کرنے اور سہنے کیلئے ہی تو پیدا کی گئی ہے۔

جس دن لویزا کے شوہر نے اس کے بھائی کو قتل کر کے اپنی بہن اقلیما کے ساتھ شادی کر لی تھی عورت کو تو اسی دن برداشت اور سہنے کا سبق مل گیا تھا۔

ایک عورت نے بھائی کے قتل کا صدمہ سہا اور شوہر کے چھن جانے کا——

تو دوسری نے شوہر کے قتل اور بھائی کے ساتھ زوجیت کے جبر کو برداشت کیا۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو دونوں اکلوتے قابیل پر جھپٹ پڑتیں اور اسے قتل کر دیتیں۔ تو آج ہم ایک قاتل اور قابض مرد اور ایک مجبور عورت کی اولاد تو نہ ہوتے۔ دونوں آپس میں شادی کر لیتیں۔ جو خدا کو یہ منظور نہ ہوتا تو وہ باغ عدن سے کوئی نیا مردان کے لئے بھیج دیتا۔ اور اگر خدا کو دونوں کیلئے ایک ہی مرد منظور نہ ہوتا تو دو مرد بھیج دیتا۔ کیونکہ بالآخر خدا کو بھی تو اپنا کاروبار چلانا تھا۔ وائے افسوس کہ دونوں پہلے ہی دن سہم گئیں، برداشت کر گئیں، اور آج تک کرتی آ رہی ہیں۔

ابھی میں اپنے خیالوں کے تلچھٹ سے باہر نہ آئی تھی کہ کندھے پر ہاتھ کا دباؤ پڑا میں نے مڑ کر دیکھا تو عائشہ کھڑی تھی۔ میں نے اشاروں میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اندر خالد والے کمرے میں پڑی سو رہی ہے۔

شکر کے ساتھ میں نے ایک گہرا سانس خارج کیا اور عائشہ کے ساتھ ہی برآمدے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس سوئے ہوئے محل کی خاموشی کو پاش پاش کرنے کی طاقت سے محروم تھی۔ بے بسی اور لاچاری نے میرے اعصاب کو بھی آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا تھا۔

رات کو آئی ہے۔ بہت چیخی ، چلائی، دھاڑیں مار مار کے روتی رہی۔ پہلے تو یہی سمجھتے رہے کہ خالد کی وجہ سے ہے۔ خالد سے محبت بھی تو بہت کرتی ہے۔ عائشہ کی آنکھیں چھلچھلا آئیں اور گلا رندھ گیا۔ ایک دفعہ سوچا کہ ابھی فون کر کے تمہیں بلا لیں کہ شاید تم اسے سنبھال سکو پھر سوچا رات بہت ہوگئی ہے۔ ہم تو اذیت میں ہیں ہی تم کو بھی نہ ڈال دیں۔ بہت ہی High

Potancy کی مسکن دوائی دودھ میں ڈال کے دی تو سوئی اور اب تک سو رہی ہے۔ اس نے سسکیوں اور سرگوشیوں میں اپنی بات ختم کی اور کچن کی طرف چل دی۔

میں نے آہستہ سے بوا خانم پر نظر ڈالی کہ تخت پہ نیم مدہوش سی پڑی تھیں۔ ابا جی جانے کب آہستہ سے اٹھ کے چلے گئے تھے وہ قدم بھی تو بہت آہستہ اٹھاتے تھے لگتا تھا ہوا کے اوپر چل رہے ہوں۔ یہ گھر میرا اپنا تھا۔ اگرچہ ابا جی میرے حقیقی والد اور امی میری حقیقی والدہ نہ تھیں۔ مگر مجھے ہمیشہ اس گھر اور ان رشتوں سے سگوں جیسا پیار ملا تھا۔ یہ میرے مومنہ کے ابا جی اور امی جو تھے اس لئے میرے بھی تھے۔

میں اٹھ کر خالد کے کمرے کی طرف لپکی۔ کواڑ پہ ہاتھ رکھا تو دماغ ہچکولا کھا گیا۔ میرے ہاتھ کے نیچے کہیں خالد کے ہاتھ کا لمس تھا۔ مومنہ کا اکلوتا جوان سال، خوبرو بھائی زندگی کی حرارت سے بھرپور، جب قہقہے لگاتا تو بھرپور قہقہے اس کے حلق سے اُبلا کرتے کہ امی گھبرا جاتیں اور پھر رکنے پر نہ آتے۔ زندگی کی رگوں سے قطرہ قطرہ راحت کشید کرنے پر مائل، چھ فٹ کا گھبرو، سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو مذاق کے انداز میں اڑا دینے کی اس کی عادت امی اور بوا خانم کو بہت کھٹکا کرتی تھی۔

بوا تو سچ مچ کی کبیدہ خاطر ہو جاتیں اور پہروں اس کی ہدایت اور اصلاح نفس کی دعائیں کیا کرتیں۔ سجنے، سنورنے کا شوق اسے عورتوں کی طرح تھا اور اس پر عجیب عادت اور مزاح کہ گھر کے کسی نہ کسی بچے کو شیشہ پکڑا کے سامنے کھڑا کیا ہوا ہے۔ خود بوا خانم کے تخت یا ابا جی کی کرسی پر بیٹھا ہے ہاتھ میں کنگھا ہے گھنٹوں سے بالوں کے ڈیزائن بناتا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ ہاتھ میں شیشہ پکڑے بچے کو ہدایات بھی جاری کر رہا ہے۔ اوپر کرو، نیچے، ادھر او یار ذرا اس طرف اور بے چارے بچے کی حالت ہو جاتی۔ اور جو بالوں کی مانگ اور سٹائل پر مطمئن ہو جاتا تو بے دم ہوا بچہ شکرانہ پڑھتا کہ جان چھوٹی مگر جان اتنی آسانی سے کہاں چھوٹتی تھی وہ بھی خالد سے، جو بچے تھک جاتے وہ فارغ ہو جاتے اور تازہ دم اس کی خدمت پر مامور ہو جاتے۔

اوئے کامران۔ اوئے ادھر آ یار یہ شیشہ پکڑ۔ اس کی ٹانگوں میں تو جان ہی نہیں ہے۔ پالنے سے نکلتے نہیں کہ بوڑھے ہو جاتے ہیں یہ آج کل کے بچے۔ وہ یکسر اتنی دیر تک مفت میں خدمت کرنے والے بچے کی خدمت کو بھول جاتا اور پھر مونچھوں کی باری آ جاتی دیر تک مونچھیں مروڑی جاتیں۔ طرح طرح کے زاویے بدل بدل کر دیکھی جاتیں، جانے مطمئن ہونے والا دماغ تو اس کو خدا نے دیا ہی نہیں تھا۔

امی اور بوا خانم جب یوں بن سنور کر اسے گھر سے نکلتے دیکھتیں تو خیر خیر پکارتیں مگر خیر آخر کب تک رہتی ہے۔ ہر خوبصورت، نفیس اور قیمتی چیز کے مقدر میں موت ذرا جلد لکھ دی گئی ہے۔ کاغذ اور کپڑے کے پھول نہ کبھی مرجھاتے ہیں نہ ان کے رنگ اُڑتے ہیں مگر جیتے جاگتے پودے پہ کھلا پھول تین دن سے زیادہ کھلا نہیں رہ سکتا کہ مرجھا جاتا ہے۔ خالد بھی ایک دن یونہی آئنوں اور بچوں کو نچاتا گھر سے نکلا اور سرخی میں ڈوبا گھر آ گیا۔

سارا گھر لہو لہو تھا۔ لہو لہو کہاں تھا۔ لہو تو سارے گھر کا وہ کہیں ساتھ ہی لے گیا تھا۔ میں وہیں کھڑی تھی۔ میرے ہاتھ کے نیچے اس کی ہتھیلی کا لمس تھا۔ اس جگہ دروازے کے ہینڈل پر اس کے خوبصورت مردانہ ہاتھ کا گرم دباؤ پڑتا ہوگا۔ انسان مرتا تو ہے مگر مرنے کے بعد پتا نہیں کہاں کہاں چپک جاتا ہے۔ خالد کی آواز، اس کا لمس، اس کی موجودگی، اس کے آفٹر شیو لوشن اور پرفیوم کی خوشبو ہر چیز جو اس کی نمائندہ تھی ابھی تک تروتازہ تھی۔

دروازے پہ ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ عجیب سی اداسی اور سوگواری اندھیرے میں مل گئی تھی۔ میں نے بیڈ پر نظر ڈالی، بیڈ خالی تھا۔ صوفہ بھی خالی تھا۔ نظر بے اختیار نیچے فرش پر چلی گئی جہاں وہ پڑی سو رہی تھی۔ اچانک ایک آنسو ٹوٹ کر میری پلکوں کی باڑھ پار کر گیا۔ مومنہ میری بچپن کی دوست اور عزیز تھی، بہت نرم، صاف اور خوبصورت دل کی مالک، بچپن سے جوانی تک کے مرحلے ہم نے ایک ہی ساتھ طے کئے تھے۔ مگر اس کی شادی اور میری ملازمت نے ہم دونوں کو جدا کر دیا تھا۔ میں اس کے اور وہ میرے دکھوں، سکھوں اور رازوں کی سانجھی تھی۔ مل کے کپڑے ڈیزائن کرنا، کھانے بنانا، سکول کالج کے کام کرنا ہمارا مشغلہ تھا۔ حتیٰ کہ کالج آتے جاتے ہوئے جو ایک دو بار ہمیں آوارہ مردوں اور لڑکوں نے تنگ کیا تو ان کی بدتمیزیوں کو روکنے کیلئے حکمت عملی بھی ہم دونوں نے مل کر وضع کی تھی۔

خالد کی بڑھتی ہوئی شرارتوں کے آگے بند باندھنے کا کام بھی ہم دونوں کا تھا۔ اس نے شادی سے قبل جی بھر کے ابا جی اور خالد سے محبت کی اور شادی کے بعد شوہر کی بھی ایسی ہی جانثار بیوی بن گئی تھی۔ ندیم، ندیم کئے جاتی۔ ہر وقت اس کے آگے پیچھے۔ ندیم بھی اس کا شیدائی تھا۔ مگر اب یہ ایسی کون سی قیامت ٹوٹی تھی کہ ندیم نے اچانک اس کو طلاق دے دی۔ وہ بھی اس کے اکلوتے نوجوان بھائی کی بے وقت اور حادثاتی موت کے محض ڈیڑھ ہفتے بعد ــــــ

وہ کسی کو کچھ بتا نہیں رہی تھی۔ اور گھر کا ہر فرد چپ تھا۔ سب ایک دوسرے کو اس نازک

کانچ کی طرح لگ رہے تھے جو زور کے سانس سے بھی تڑخ جاتا ہے۔ سناٹا دیوار و در کے اندر کیکٹس کی طرف اُگ آیا تھا۔ ایسا کیا ہوگیا تھا مومنہ سے جو ندیم نے طلاق دے دی۔ گھر کے اندر چپ کے ڈیرے تھے اور چپ کی بُکل میں اندیشے، وسوسے، خوف اور رسوائیاں چھپی تھیں۔ دماغوں کے اندر خوف کلبلا رہے تھے کیونکہ اس گھر کی بیٹی کو طلاق ہوئی تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر اسی گھر کے مرد نے طلاق دی ہوتی تو دماغوں کے اندر خوف اور اندیشوں کی بجائے وضاحتیں اور تاویلیں کلبلا رہی ہوتیں۔ مائیں بیٹوں کی پیدائش پر اس لئے خوش ہوتی ہیں کہ ان کے ساتھ اندیشے اور رسوائیاں جنم نہیں لیتیں مگر بیٹی کے جنم کے ساتھ ہی خوف، خدشے اور اندیشے بھی جنم لے لیتے ہیں جو کہ آخری سانس تک جان کا بوجھ بنے رہتے ہیں۔

میں نے آہستہ سے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں کو سہلایا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ مسلسل رونے سے آنکھیں متورم ہوگئی تھیں وہ آہستہ سے اٹھی اور وہیں قالین پر بیڈ کے ساتھ سر کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کا سر پکڑ کر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اس گھر کے ہر بے بس فرد کی طرح میں بھی بے بس تھی۔ وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہوگئی اور میں چپ چاپ اس کے بالوں کو سہلاتی رہی۔ مومنہ کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟ مجھے اپنی آواز کہیں اور سے آتی ہوئی لگی۔ کیا ہوا تھا ایسا کہ ندیم نے ــــــ

سب لوگ بہت پریشان ہیں۔ خدا را بتاؤ کیا ہوا؟ اس کی آنکھوں میں ایک دم حیرت اور دکھ سمٹ آیا۔ وہ بے پناہ تاسف اور حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھتی رہی، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ تم سب لوگ تو یوں میری تفتیش کر رہے ہو جیسے میں گناہ گار ہوں۔ میں نے کوئی گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں ندیم نے مجھے ــــــ

وہ پہلے تو سسکی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اگلا کتنا ہی وقت پھر اس کو سمیٹنے میں لگ گیا جب ذرا بحال ہوگئی تو میں اٹھ آئی۔

ندیم کے گھر میں بھی سناٹا تھا۔ مومنہ سے ہر بندہ مایوس ہوگیا تھا۔ وہ طلاق کی وجہ بتا نہیں پا رہی تھی۔ ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی۔ کئی بار بولنے پر آئی مگر پھر لب کپکپا کے بھینچ گئے اور پھر کبھی نہ کھلے۔ مایوس ہو کر میں نے ندیم کے گھر کی راہ لی تھی۔ امی اور عائشہ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ یہ سناٹے تو سکندر ہی بن گئے ہیں ہر طرف اب انہی کا راج ہے۔ میں نے کھنگورا مارا تاکہ خوب گلا پھاڑ کر کسی کو آواز دے سکوں کہ بغل کے کمرے سے آہستہ سے چپل گھسیٹنے کی آواز آئی اور

اگلے ہی چند لمحوں میں بھابھی رضیہ کمرے سے باہر تھیں۔ خاموشی سے گلے ملیں اور چپ چاپ کتنی ہی دیر مجھے ساتھ لگائے رہیں۔ پھر اسی خاموشی کے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئیں۔

میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ مگر وہ چپ رہیں۔ ہر طرف چپ کا راج تھا۔ جانے راز کیا تھا۔ مگر وجہ جاننا بھی ضروری تھا۔ ادھر گھر کے سارے لوگ بے موت مر رہے تھے۔ مومنہ بے قصور ہو کر بھی اعتراف یا اقرار کی جرأت سے خالی ہو چکی تھی۔ بھابھی رضیہ ہی اس راز کو واشگاف کر سکتی تھیں۔ میں نے تھک ہار کر انہیں ہاتھ جوڑ دیئے۔ بھابھی رضیہ کا سانس حلق میں اٹک گیا۔

بس کر، بس کر، بس کر اور میرے ہاتھ پکڑ کر اگلے ہی لمحے وہ کھل گئیں۔ اب کی بار سانس میرے حلق میں اٹک گئی۔

''کتا، دلا، بے غیرت، لعنتی، جہنمی، دروزخی، یہودی، مجوسی، جو جو گالی اس وقت میرے منہ میں آئی میں نے ندیم کی طرف غائبانہ اچھال دی

میرا بس چلتا تو اس مردار خور، گِدھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی کتے کے آگے ڈال دیتی۔

مومنہ کی بے بسی کی مجھے اب سمجھ آئی تھی۔

جوان بھائی کی موت کے صدمے سے سلگتی مومنہ اس کے بستر پر جانے کیلئے خود کو تیار نہ کر سکی تھی تو کیا یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کو طلاق دے دی جاتی؟؟؟؟

''وہ کم از کم خالد کی موت کے پندرہ دن تو گزرنے دیتا''۔

میرا جی چاہا کہ یہ فرش چاک ہو جائے۔

اور میں اتنی زور سے چیخوں کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں۔

یہ دُنیا چار دن کی ہے

تم نے کبھی گدھے کو اڑتے ہوئے دیکھا ہے؟

نہیں

بھینس کو؟

نہیں

درخت کو؟

کیا بکواس ہے بند کرو یہ بک بک ـــــ

ہاہاہا ـــــ اس نے قہقہہ لگایا اچانک اس کے پھیلے ہوئے جبڑوں نے پوزیشن بدلی اس کی آنکھیں ابل پڑیں ہونٹ سکڑ گئے اورانگلیوں کے آگے لمبے لمبے ناخن اگ آئے وہ بری طرح اس پر جھپٹا بے ہودہ انسان دفع ہوجاؤ یہاں سے۔ پتا ہوتا کچھ نہیں اورآ جاتے ہیں کھوج لگانے، ٹوہ لگانے اپنے وجود تک کی خبر نہیں۔ چلے ہیں دوسروں کے رمز تلاش کرنے، مرض ڈھونڈنے عقل کے غلام کمینے کوڑھی اوراس کے ساتھ ہی اس نے زور سے زمین پر تھوکا اور خود کو گھسیٹتا ہوا دوسرے سرے پر چلا گیا وہ پھراس کی طرف ہوا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا آپ کے ماں باپ کون تھے؟

کوئی بھی نہیں ـــــ ٹکا سا جواب ملا ـــــ

آپ کا کوئی وطن تو ہوگا؟ میرا مطلب آپ کہاں کے ہیں؟

کہیں کا بھی نہیں ـــــ پھروہی جواب آیا ـــــ

آپ کا مذہب، کوئی عقیدہ؟؟

انسانیت، مختصر جواب آیا ـــــ

رحمانی کی انگشت شہادت بے اختیاراس کے دانتوں کے نیچے دب گئی تو یہ ہے وہ عجیب الخلقت لوتھڑا، گندہ، بدبودار، حقیر، جس کے نہ ماں باپ، نہ ملک نہ ملت، نہ زبان نہ ثقافت، نہ جان نہ پہچان، جس کا کوئی والی نہیں وارث نہیں جس کی کوئی جڑ نہیں کوئی مرکزہ نہیں محض انسانیت ہی انسانیت ہے اوراس کے اخبار کے مالک نے یہ کس طرح کی اسائمنٹ اس کو دی ہے حضوری مسجد کے ساتھ والی گلی کے پرانے مندر کے سامنے والے جنڈ کے نیچے جوایک لوتھڑا نما انسان پڑا رہتا ہے اس کا جا کے انٹرویو کرو جس شخص کے حواس ہی مجتمع نہیں وہ معاشرے کا صحت مند مرد نہیں اس کا انٹرویو لینے میں آخر اخبار کے مالک کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور پھراس کی یہ اوٹ پٹانگ باتیں جن کا کوئی سرا ہے نہ کوئی اتھاہ رحمانی اپنا انٹرویو پیش کروشازیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی حکم دیااس نے کاغذ اٹھائے اورجلتا بھنتا ہوا چیف ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوا ہاں بھئی کدھر ہے انٹرویو ـــــ چیف ایڈیٹر صلاح الدین نے سگریٹ کا کش لگا کر پوچھا انٹرویو کیا ہونا تھا سر ـــــ اس گوشت کے لوتھڑے نے پہلے تو میرا انٹرویو لے ڈالا پھر مجھ پر جھپٹا اوراس کے بعد میرے ہرسوال کے جواب میں ''انسانیت'' کا لفظ بول کر مجھے گھر کی راہ دکھادی ـــــ ہوں، صلاح الدین نے پرشوخ انداز میں ہنکارا بھرا تو گویا ہراس سوال کا جواب انسانیت ہے کل کے ایڈیشن کا ٹائٹل لگادو ''انسانت'' اورصلاح الدین کے اس حکم کے ساتھ ہی رحمانی اور شازیہ دونوں کا منہ کھل گیا۔

رحمانی ایک بہت بڑے وسیع وعریض کشادہ ڈرائنگ روم کے اندر بیٹھا تھا جس کی ایک دیوار پر ملک کی برسراقتدار پارٹی کے سربراہ کی تصویر لگی تھی عقیدت کے اظہار کے طور پر اورکئی تصویریں لگائی گئی تھیں یہ عوامی خدمت گار کا ڈرائنگ روم تھا اتنے میں عوامی خدمت گار بڑے اعزاز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے رحمانی نے اٹھ کر تعظیم دی۔

سر اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ رحمانی سراپا اشتیاق بن گیا عوامی خدمتگار نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔

جی میں غیاث احمد چیمہ، اس وقت ممبر آف قومی اسمبلی ہوں میرے والد سراج احمد چیمہ حلقہ این اے ۴۶ سے چار مرتبہ ایم این اے منتخب ہوئے دومرتبہ انہوں نے کابینہ کا انتخاب جیتا، میرے دادا صدرالدین چیمہ علاقے کے رئیس تھے قیام پاکستان کے وقت قائداعظم کے قریبی ساتھیوں میں رہے میرے تایا پاکستان کے پارلیمانی سیکرٹری رہے ہیں میرے پھوپھا پاکستان سپریم کورٹ کے اٹارنی رہے میرے ہم زلف چوہدری عمر عطاء اللہ گھڑانی کمبوڈیا، مالٹا اور سوڈان میں

پاکستان کے سفیر رہے ہیں میرے صاحبزادے بھی سیاست میں آنے کے لیے تیار ہیں اور اس مقصد کے لیے خاص اعلیٰ تعلیم یورپ کے تعلیمی اداروں سے حاصل کرر ہے ہیں تعارف کا یہ سلسلہ کافی دیر کے بعد جا کر تھما۔

جناب آپ کی پچھلی چار نسلیں ماشاء اللہ رئیس، جاگیردار اور سیاست میں ہیں مگر اس کے باوجود آپ کے حلقے میں ترقی کے آثار نہیں ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

دیکھیں جی ہم سے جو کچھ ہوسکتا ہے وہ ہم کرتے ہیں پاکستان کے باقی حلقوں میں بھی تو سیاست دان برسوں سے یہی کچھ کرر ہے ہیں ناں جی۔ ان کو ذرا سی چھوٹ دی جائے تو بغاوت پر اتر آتے ہیں ان کو ذرا دبا کر رکھنا پڑتا ہے سیاست کا یہی قدیم اصول برسوں سے چلا آرہا ہے ہم نے آج تک اپنے پرکھوں کے طے کردہ اصولوں کے ساتھ بغاوت نہیں کی ہم بااصول اور باضمیر لوگ ہیں جی۔

آپ کا تعارف تو بہت طویل ہے چیمہ صاحب، مگر عوامی خدمت کی فہرست کافی چھوٹی ہے اس تضاد کا کبھی خیال نہیں آیا آپ کو۔

دیکھیں جی ان بدبخت لوگوں کی جہالت ہم کم نہیں کر سکتے ہمارے اندر خاندانی سلسلے اور رسم و رواج ہی اتنے ہیں کہ ان پر پورا اتر جائیں تو بھی بڑی بات ہے برادری اور اپنے جیبوں کی نظر میں وقار قائم رکھنا بڑی بات ہے ان لوگوں کا کیا ہے ان کی تو اپروچ ہی اتنی سی ہے کہ اگر ہمیں ووٹ نہ دیں تو کیا کرملی مصلی کو دیں آپ دیکھتے ہیں یہ صدیوں سے ہمیں ووٹ دیتے آرہے ہیں تو کیا یہ پاگل ہیں یہی سیاست ہے جی ان لوگوں کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم ان کے درمیان رہ رہے ہیں ان کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کہ ہم ان کے ساتھ ہیں ہماری جڑیں یہاں پر ہیں ورنہ گھر تو ہمارے پاکستان کے ہر بڑے شہر کے اندر موجود ہیں ہم وہاں بھی تو جا سکتے ہیں اور مارے جوش کے چیمہ صاحب کا سینہ پھول گیا اور آنکھیں پھٹ پڑیں۔

رحمانی کا انٹرویو کامیاب رہا تھا اگلے ہفتے رحمانی ایک اور ڈرائنگ روم کے اندر تھا۔ کھلے اور وسیع ڈرائنگ روم کے اندر ایک طویل دیوار پر ایرانی غالیچہ لٹک رہا تھا جس کے اوپر خانہ کعبہ کی تصویر بنی تھی اور دوسرے پر روضہ رسول ﷺ کی تھی ابھی وہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا کہ مولانا صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے رحمانی مؤدب کھڑا ہوگیا السلام علیکم مولانا صاحب نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے جن میں سے ایک کے اندر تسبیح جھول رہی تھی۔

وعلیکم السلام: رحمانی کی نظریں تعظیماً جھکتی ہی چلی گئیں۔

مولانا صاحب آج کے حالات پر کچھ تبصرہ فرمائیے۔

استغفراللہ بڑا ہی کفر کا دور دورہ ہے نوجوان نسل بالخصوص تباہی و بربادی کی طرف جا رہی ہے اہل یہود اور نصاریٰ کی ثقافت کو مذہب بنالیا گیا ہے شرم و حیا نہیں رہی بزرگوں کا ادب مفقود ہوگیا ہے اب تو اس قوم پر عذاب نازل ہو ہی جانا چاہیے۔

اگر قوم پر عذاب نازل ہوتا ہے تو کیا آپ بچ جائیں گے مولانا صاحب یا آپ بھی اس عذاب کی گرفت میں آجائیں گے؟

اس سوال کے ساتھ ہی مولانا صاحب کے لہجے میں خطابت نما کڑک آئی اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے جسموں کو مٹی نہیں کھائے گی ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا بلکہ جو فاسق و فاجر ہیں جو گناہ کرتے ہیں وہ اس کی زد میں آئیں گے۔

مولانا صاحب آپ مذہبی پیشواؤں نے مل کر پہلے لوگوں کو گروہوں میں بانٹا ہے اور پھر ہر گروہ کے اندر دوسرے کے خلاف نفرت بھری ہے اور ایک خدا کے نام پر لوگوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنادیا ہے کیا مذہب اسی لیے دنیا میں اتارا جاتا ہے کہ لوگوں کو گروہوں میں منتشر کر کے ان سے ایک دوسرے کے گلے کٹوائے جائیں رحمانی جذباتی ہوگیا۔

کیا بے دینی کی باتیں کرتے ہیں آپ مغربی تعلیم نے آپ کے دماغوں کو گمراہ کردیا ہے عقیدہ درست رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ برزخ، یوم الحساب اور ہمیشہ کی دوزخ ہمارا مقدر بن سکتی ہے آج مغرب میں ہمارے آقا دو جہاں ﷺ کے (معاذاللہ) خاکے بنائے جارہے ہیں ہمارے ایمان کو آزمایا جارہا ہے محبت پکارتی ہے کہ آؤ گھروں سے باہر نکلو اور اس طرح کی حرکت کرنے والوں کے سرتن سے جدا کردو ـــــ رحمانی کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ درمیان میں بول پڑا قطع کلامی معاف مولانا صاحب!

آپ تو اپنے حجروں میں بیٹھ کر اس طرح کے فتوے جاری کردیتے ہیں اور لوگ گھروں سے باہر نکل آتے ہیں اور ایک دوسرے کے سرتن سے جدا کرنے لگتے ہیں پرانی رنجشوں کے بدلے ایک دوسرے کی دکانیں اور املاک جلا کر لیے جاتے ہیں مذہب کے نام پر انتقام لینے کا ایک خوبصورت طریقہ لوگوں کے ہاتھ آجاتا ہے تخریب کاروں کو تخریب کاری کرنے کا کھل کے موقع میسر آتا ہے اور مذہب کے نام پہ ہونے والے یہ سارے دنگے شیطان اور اس کے کارندوں کو بہت خوش

کرتے ہیں مولانا صاحب لوگ جو آپ لوگوں کی باتوں پر کان دھرتے ہیں آپ لوگوں کو آئیڈیلائز کرتے ہیں عقیدت سے آپ لوگوں کے ہاتھ چومتے ہیں آنکھوں پر لگاتے ہیں اور آپ کی باتوں کو حرف آخر سمجھتے ہیں آپ لوگوں کے فیصلوں کو خدا کے فیصلے مانتے ہیں تو کیا آپ لوگوں پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ انہیں گمراہ کرنے کی بجائے ایجوکیٹ کریں محبت، رواداری اور امن کا درس دیں وہ جو آپ لوگوں کے کہنے پر ایک دوسر کے گلے کاٹ سکتے ہیں ایک دوسرے کے گھروں کو آگ لگا سکتے ہیں ایک دوسرے سے محبت بھی تو کر سکتے ہیں؟

اور ہاں مولانا صاحب آج یورپ ہمارے آقا ﷺ کے متعلق طنزیہ خاکے کیوں بنا رہا ہے یہ بھی آپ لوگوں کی کمزوری کی وجہ سے ہے ہمارے مذہبی پیشوا جو ایک طرف آپ ﷺ کو رحمت اللعالمین ﷺ بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف میرے آقا ﷺ میرے آقا ﷺ کہتے ان کی زبان نہیں تھکتی ذرا سوچئے! رحمۃ اللعالمین ﷺ کا کیا مطلب ہے تمام جہانوں کے لیے رحمت اور تمام جہانوں میں صرف مسلمان نہیں آتے اس میں ہندو عیسائی، یہودی، سکھ، بدھ ہر مذہب ہر ملک ہر ملت ہر رنگ ہر نسل ہر زبان ہر خطے کے لوگ آتے ہیں پھر کیوں آپ لوگوں نے میرے آقا ﷺ میرے آقا ﷺ کہہ کہہ کر رحمۃ اللعالمین ﷺ پر اس طرح کے ملکیتی حقوق جما لیے کہ دوسری ساری قوموں نے یہ تاثر لے لیا کہ وہ دوسری ساری قوموں کے نبی نہیں اگر آپ مذہبی پیشواؤں نے آقا ﷺ پر ملکیتی حقوق حاصل نہ کیے ہوتے اور باقی ساری قوموں کو یہ احساس دلایا ہوتا کہ نبی آخر الزمان ﷺ ان کے بھی نبی ہیں اور قرآن پاک ان کا بھی قرآن پاک ہے تو آج ہمارے دل نہ دکھتے اور آج مذہبی منافرت کے نام پر ہم ایک دوسرے کے گلے نہ کاٹتے ایک دوسرے کے گھر نہ جلاتے اور خود کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم نہ کرتے اس کے ساتھ ہی رحمانی نے اپنی فائل اٹھائی اور زن سے باہر نکل گیا۔

مولانا صاحب کے ساتھ اس کا انٹرویو بظاہر تو کامیاب تھا مگر اس کے اپنے نزدیک یہ اس کی زندگی کا بدترین انٹرویو تھا۔

کتابوں سے بھرے کمرے میں بیٹھے بیٹھے رحمانی کو اکتاہٹ ہونے لگی پہلے تو کتابوں نے اس کو دیکھ کر گھورنا شروع کیا پھر اونچے اونچے سانس لینے لگیں اس کے بعد انہوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں اور اس کے بعد اونچے اونچے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اس سے پہلے کہ رحمانی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ایک طرف لکڑی کا دروازہ چرچرایا اور گنجے سر، سبز قمیض، سفید شلوار کے ساتھ میرون

شیروانی پہنے آنکھوں پر چشمہ لگائے دانشور صاحب کمرے میں داخل ہوئے رحمانی سراپا تعظیم بن گیا۔

دانشور نے ہاتھ کے اشارے سے رحمانی کو نشست کا کہا رحمانی بیٹھ گیا۔

جی تو آپ میرے ساتھ کیا کرنے آئے ہیں؟ بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

جی دست درازی تو کر نہیں سکتا آواز بہت دھیمی تھی چند سوال پوچھنے آیا ہوں۔

جی پوچھیے۔

میں نے اکثر دانش وروں کو جب وہ سٹیج پر کھڑے ہو کر اپنے علم و دانش کی کرنیں بکھیر رہے ہوتے ہیں یہ کہتے سنا ہے کہ میں ڈر رہا ہوں میں سچ نہ کہہ دوں جب انسان پر سچ اور جھوٹ واضح ہو جائے تو اس کے بعد وہ سچ کے بولنے میں مصلحت کا شکار کیونکر ہو سکتا ہے؟

کیا تمہیں پتا ہے دانش ور کس کو کہتے ہیں دانش ور نے الٹا سوال داغ دیا۔

جی آپ جیسے لوگوں کو ــــــ رحمانی گڑبڑا گیا۔

ارے باؤ دانش ور اسی کو کہتے ہیں جو مصلحت کے تحت جھوٹ بولے جو سچ کو جان کر بھی چھپائے جو حکمرانوں کے مفادات کا تحفظ کرے دانش ور کے پاس چند جملے اور چند سے زائد الفاظ ہوتے ہیں جن کی ترتیب کو بدل کر مختلف مقامات پر سنانے میں اسے مہارت حاصل ہوتی ہے بالکل سٹیج کے اس بھانڈ کی طرح جو ہر شہر اور ہر چینل پر ایک ہی جیسے رٹے رٹائے جملے بول کر داد و نقد وصول کرتا ہے دانش ور کا کام بس یہی ہے کہ اپنی حفظ شدہ لائنیں ترتیب بدل کر بولتے وقت درمیان میں کچھ اس طرح کے جملوں کی گرہ لگا دیتا ہے کہ لوگوں کے جذبات اس کی پاکیزگی، بلندی اور اوج فکری کے خیال سے اُمڈ اُمڈ آتے ہیں۔

وہ وہی بولتا ہے جو اس سے بلوایا جاتا ہے۔

وہ وہی کہتا ہے جو اس سے کہلوایا جاتا ہے۔

میرے بچے دانش ور کوئی تم جیسا سرپھرا منادی نہیں ہوتا کہ خواہ مخواہ کے سچ بول کر دنگا کرتا پھرے۔

بس آپ سے ایک آخری سوال ہے؟

شرمین عبید چنائے، مختاراں مائی اور ملالہ یوسف زئی کی یورپ کی طرف سے پذیرائی پر سارے دانش وروں نے خوب نظمیں لکھیں غزلیں کہیں افسانے لکھے مضمون چھاپے، کاروبار بڑا گرم رہا مگر تین ایسی ہی لازوال بیٹیاں یورپ کے ہاتھوں نیست و نابود ہو گئیں عافیہ صدیقی، مومنہ

چیمہ، ارفع کریم رندھاوا ان تینوں کا کسی نے نوحہ تک نہیں لکھا۔

شرمین عبید چنائے نے مختاراں مائی نے، ملالہ یوسف زئی نے نہ صرف مذہب کا بلکہ ملک کا اور ثقافت کا سارا گند اٹھا کر چوراہے میں رکھ دیا وہ گند جو یورپ کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے ان کو آپ نے اعزاز دیئے ایوارڈ دیئے تالیاں بجائیں اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی، ارفع کریم رندھاوا اور مومنہ چیمہ جو اس ملک، مذہب ثقافت کا مغز تھیں مان تھیں اوج تھیں ان کی قبریں سوالیہ نشان بنی ہوئی ہیں کیا یہی دانش ہے؟

ہاں یہی دانش ہے

کہاں ہے وہ سچ جو آپ لوگوں کے لبوں پر آ کر اٹک جاتا ہے۔

وہ سچ مر چکا ہے

وہ مر جانے والا سچ کیا ہے؟

وہ سچ امن ہے برابری ہے مساوات ہے

امن اور مساوات کا منبع کیا ہے؟

امن اور مساوات کا منبع محبت ہے

محبت کہاں گئی؟

محبت کہاں جا سکتی ہے محبت کا کوئی مذہب، کوئی لباس، کوئی زبان، کوئی رنگ، کوئی نسل، کوئی موسم، کوئی خطہ نہیں ہوتا محبت ظرف زماں اور ظرف مکاں کے دائروں میں نہیں آتی محبت کہیں تو تب جائے گی جب اس کا کوئی وطن ہوگا کوئی زبان کوئی ثقافت ہوگی؟ جب وہ زماں ومکاں سے ماورا ہے تو پھر کہاں جا سکتی ہے اس کا مطلب ہے ادھر ہی کہیں ہے؟ رحمانی کے دیدے پھیل گئے ہاں ادھر ہی ہے ڈھونڈنی پڑتی ہے مل جائے تو بانٹنی پڑتی ہے یہی سچ ہے امن سچ ہے امن محبت میں ہے محبت انسانیت میں ہے دانش ور نے عینک اتاری اور آہستہ سے اٹھ کر کمرے کے اندر سے نکل گیا۔ کیا تم نے کبھی گدھے کو اڑتے دیکھا ہے؟

نہیں

تمہارا مذہب کیا ہے؟

انسانیت ـــــ ہاہاہا

زمین رحمانی کے چاروں اور گھوم گئی۔

زندگی اور موت کے بیچ کی سیٹی

''میری کھال ڈھیلی ہو کر لٹک رہی ہے۔''

''اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق تو پڑتا ہے یہ تبدیلی کا عمل بوسیدگی لاتا ہے۔''

''مگر یہ تبدیلی تو نہیں ـــــ یہ تو نشوونما کا عمل ہے۔''

نشوونما کے لفظ سے تو صحت کا تاثر اُبھرتا ہے مگر میں تو دیمک زدہ ہو گئی ہوں۔ نہیں درخت ایک ہی جگہ کھڑا کھڑا بڑا ہو جاتا ہے تو یہ تبدیلی نہیں ہوتی۔ جسم بڑھ جائے تو بھی تبدیلی نہیں ہو گی۔ یہ بڑھاوا ہے۔ نشوونما ہے یا کچھ اور مگر تبدیلی نہیں ہے۔''

اُس نے کہا۔

''شاید تمہیں بہتر پتہ ہو۔''

اُس نے کندھے اُچکائے۔

وہ دونوں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ریل گاڑی کے انتظار میں تھے۔

وہ اُس سے خودکشی کرنے کے لیے مشورہ لینے آئی تھی اور وہ اُس کے ساتھ ہو لیا تھا۔

''آج رہنے دو، کل خودکشی کر لینا۔''

''نہیں میں پچھلے دو سال سے اس کو ملتوی کرتی آ رہی ہوں۔ میری موت التواء کا شکار ہو رہی ہے۔ موت کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔''

''مرنے کے بعد کیا کرو گی تم۔''

اُس نے پوچھا۔

''یہ بتانا قبل از وقت ہے۔ ہا—— شاید کوئی اچھا سا کام۔''
اُس نے کہا۔
''کس قسم کا کام کرو گی تم؟''
اُس نے پھر پوچھا۔
''کوئی بھی جو اگلی موت کی طرف نہ جانے دے۔''
اُس نے کہا۔
''موت کے بعد تمہیں جو لوگ ملیں گے وہ کیسے ہوں گے؟''
اُس نے پوچھا۔
''زیادہ تر بوڑھے، تھکے ہارے، کمر خمیدہ لوگ ہوں گے۔''
وہ بولی۔
''تم جو ایک معقول عمر کے لوگوں میں اُٹھتی بیٹھتی ہو۔''
''ہاں! میں اُن کے ساتھ گزارا کر لوں گی۔''
''ہم بالکل کیڑے مکوڑے ہیں۔''
پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ پُر خیال انداز میں بولا۔
اُس نے دوسرا ہاتھ اُس کی کمر کے گرد حائل کر لیا۔
''ہاں بالکل! پاؤں کے نیچے آسانی سے کچلے جا سکتے ہیں۔''
وہ بولی۔
''اس طرح نہ دباؤ——''
اس نے اُس کے کمر کے گرد پھیلے ہوئے ہاتھ کو پکڑ کر احتجاج کیا۔
''کیوں کیا ہوتا ہے تمہیں۔''
اُس نے گرم سانس اُس کے منہ پر چھوڑی۔
''تم کمینے آدمی میری خودکشی کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہو۔''
اُس نے اُس کا ہاتھ ہٹانا چاہا۔
''میں تو بس دیکھ رہا تھا کہ واقعی تمہاری کھال لٹک رہی ہے یا نہیں۔''
وہ اور قریب ہوا۔

اُس نے اس کو پیچھے دھکیل دیا۔ پھر دونوں چلنے لگے۔
''ہم کیڑے مکوڑے ہیں، پاؤں کے نیچے کچلے جا سکتے ہیں، ہیں ناں۔''
وہ بولا۔
''ہاں بالکل ——''
وہ کہیں کھو گئی تھی۔
''تو پھر خودکشی کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔''
وہ بولا۔
وہ چپ ہو گئی۔
''ریلوے لائن پر ہڈیوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ کیا سارے لوگ ریلوے ٹریک پر خودکشی کرتے ہیں۔''
وہ اُس کے ساتھ لگ کر بولی۔
''نہیں، نہیں تو۔ یہ ہڈیاں تو مزدوروں کی ہیں۔ جو اس ٹریک کو بناتے رہے ہیں۔''
''وہ زندہ رہنے کے لیے ٹریک بناتے رہے یا مرنے کے لیے۔''
''پتا نہیں۔ شاید، جینے کی اس طرح کی تگ و دو موت کی طرف لے جاتی ہے۔''
''زندگی چاہے کسی بھی طرز کی ہو اس کی جستجو موت کی بازیافت ہی تو ہے۔''
وہ بولی۔
''نہیں۔ زندگی موت کا آغاز ہے۔
نہیں۔ زندگی موت کے اندر ہے۔
نہیں۔ موت زندگی کے اندر ہے۔
دونوں ساتھ ساتھ بھی تو ہو سکتی ہیں۔''
وہ بولا۔
''وہ کیسے؟''
''تم جو خودکشی کرنے جا رہی ہو۔ میرے ہاتھ سے کیوں ڈرتی ہو۔ جو تمہارے اندر گرمی اُبھارتا ہے۔''
وہ بولا۔

"یہ تمہارا Hypothesis ہے۔ ہاں۔ واقعی۔"

وہ اُلجھ جاتی ہے۔

"میں تمہارے پاس خودکشی کے بارے میں مشورہ کرنے آئی تھی مگر تمہارا ہاتھ حیات زا ہے۔ آج یہ کام ہو ہی جانا چاہیے۔ تم مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔"

"آخری بار میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔ تم آخر مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔"

اس نے پوچھا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے ہونٹ، دوسری عورتوں کے ہونٹوں سے کس حد تک مختلف ہیں۔"

"ساری عورتوں کے ہونٹ ذائقے میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"تو پھر ساخت میں ایک جیسے کیوں نہیں ہوتے؟"

"ساخت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل چیز ذائقہ ہے۔"

"اصل چیز ذائقہ ہے اور ذائقہ یکساں ہے تو پھر خوب صورتی اور بدصورتی کے معیارات کیوں ہیں۔"

"معیارات دماغوں کے اندر ہوتے ہیں ورنہ زبان اور تالو کی حد تک تو سارے ہونٹ ذائقے میں ایک جیسے ہیں۔"

"دماغوں کے معیارات ہی تو اونچ نیچ لاتے ہیں، ورنہ اونچ نیچ کہاں ہے۔ تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہو۔"

اُس نے پھر پوچھا۔

"بظاہر تو کوئی وجہ نہیں۔ میرے جسم میں کہیں کوئی درد نہیں۔"

"ایک دفعہ پھر سر سے لے کر پاؤں تک اپنے وجود کا جائزہ لو، کہیں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

وہ رُک جاتے ہیں۔

وہ آنکھیں بند کر کے اپنے جسم کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتی ہے۔ کہیں بھی بدن کے اندر درد کا کوئی اشارہ نہیں آیا۔

"میں اس وقت کتنے آرام اور سکون میں ہوں۔ میرے جسم میں کہیں بھی کوئی درد اور

تکلیف نہیں ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں اور چلائی۔

"پھر تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہو۔"

وہ بولا۔

"یہاں ہڈیوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ ان کے نیچے میری ہڈیاں دبی پڑی ہیں۔ جن تک کسی بھی نظر کی رسائی نہیں ہے۔ مجھے خلجان ہو رہا ہے۔"

"تم دماغ کی سزا ہڈیوں اور گوشت کو کیوں دیتی ہو؟"

اس نے پوچھا۔

"دماغ کی سزا ہمیشہ ہڈیوں اور گوشت کو ہی ملتی ہے۔"

وہ بولی۔

"تمہارے شعور اور سوچ کا اگر کوئی وجود ہوتا تو میں اُن کو پکڑ کے سیدھا جہنم میں ڈال دیتا۔"

وہ غصے میں آ گیا۔ چلتے چلتے دونوں ریلوے ٹریک سے دُور نکل گئے۔

"ہم ٹریک سے بہت دُور نکل آئے ہیں۔"

اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اُس کو پکارا۔

"تم نے خودکشی کرنی ہے اور ریل آنے والی ہے۔ واپس چلو۔"

مگر وہ نہیں بولی اور آگے کی طرف بڑھتی گئی۔ جس طرف سے سورج نکل کر مغرب کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ ریل کی سیٹی کی آواز آئی اور آتی چلی گئی۔

بس یونہی

جولائی کے گرم حبس زدہ مرطوب موسم نے اُس کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور اُسے اچانک یاد آیا کہ بچپن میں ایک دفعہ اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے ایک دست شناس نے کہا تھا کہ اُس کی عمر ۷۷ سال تک ہے اور اس کے ساتھ اُس کو ایک جھرجھری آ گئی۔ اگر اُس کی عمر واقعی ۷۷ سال ہے تو اس کا مطلب ہے۔ اُس کو آیندہ مزید پچاس جولائی برداشت کرنے ہوں گے، کتنا دہشت خیز خیال ہے۔ حیدر کے پاس جانے تک کے نہ جانے کتنے ہی مراحل تھے، جن میں پہلا مرحلہ تو پیدل سفر کا تھا۔ جو گھر سے سڑک تک اختتام پذیر ہوتا تھا۔ پھر سڑک کنارے کھڑے ہو کر بس کا انتظار اور بھی جان لیوا ہو جاتا تھا۔

اس دوران سڑک پر سے گزرتے ہوئے رکشوں، سکوٹروں، ریڑھیوں، بسوں، سائیکل والوں کی اُلجھی ہوئی عام، سادہ، گندی، خراب بہکی ہوئی، طرح طرح کی نظروں کی تپش الگ سارا بدن ہولا کر رکھ دیتی تھی۔ پسینے کے بہنے کے احساس نے اُس کے مزاج کی نفاست کو کرکرا کر دیا۔ نہا دھو کر، دُھلا ہوا لباس پہن کر خوشبو لگا کر باہر نکلنے کا فائدہ کیا ہوا اور پھر حیدر کے اصرار پر اُسے بے طرح غصہ آنے لگا۔ ہر وقت ملنے کی پڑی رہتی ہے مردود کو ـــــ حسب معمول وہ اپنے دفتر میں بیٹھا مل گیا۔ ایک تحیر آمیز ہچکچاہٹ کہ جس کے اندر خوشی بھی تھی، اس کے چہرے پر عیاں ہوگئی۔ اُس کی نشست کے بعد وہ خود کو کسی صورت حال کے لیے تیار کرتا رہا جیسا کہ وہ جانتی تھی کہ اُس کو چند منٹ چاہییں تاکہ وہ اپنی سوچ کو سنبھال سکے جو کہ اُس کی نشست کے بعد بھٹک جاتی تھی وہ شدید غصے میں تھی ـــــ

''گرمی میں تم سے ملنے آتی ہوں، کیا تمہیں اس بات کی قدر و قیمت کا احساس ہے؟''

ـــــ وہ جل کر بولی تھی ـــــ

''یار! تمہیں دیکھے بغیر رہ نہیں سکتا۔''

اُس نے وضاحت پیش کی۔

''رہ نہیں سکتے تو چل تو سکتے ہو، کیا ہمیشہ میرا ہی یہاں آنا ضروری ہے۔''

''یار سوہنی بھی تو گھڑے پر تیر کر جاتی تھی ماہیوال کو ملنے۔''

''اور اسی آدت جاوت میں مر گئی، عشق و محبت کے اندھیارے میں یہ تحقیق بھی نہ کر سکی کہ اس بار گھڑا کچا تھا۔''

''کس نے کہا ہے کہ سوہنی عشق کے اندھیارے میں مری، وہ تپ گئی تھی۔ سوہنی کو تو سی فوڈ کا شوق لے ڈوبا۔''

''کیا کیا مطلب؟؟؟''

''مطلب یہ ہے کہ اس کو اُس مچھلی کے باربی کیو کی اشتہا ماہیوال کے پاس لے جاتی تھی۔ جو وہ اُس کے کھانے کے لیے تیار کر کے بیٹھا ہوتا تھا۔''

''چلو مان لیا کہ وہ باربی کیو کھانے جاتی تھی، آج کل بھی لڑکیاں سی فوڈ اور باربی کیو کے لیے بڑے رسک لے جاتی ہیں، مگر یہ بتاؤ کہ پھر ماہیوال کو کیا غرض تھی اُس سے کہ وہ اُس کے لیے مچھلی کے کباب بنائے بیٹھا ہوتا تھا۔''

''مردوں کو بس ـــــ عورت کے نظارے اور اس کے لمس کا چاؤ ہوتا ہے اور یہ کوئی محبت کا آفاقی اصول نہیں، سادہ سی شریف سی مردانہ فطرت ہے۔''

''ہیر کو رانجھے کے ساتھ کیا نسبت تھی۔ ہیر تو باربی کیو کھانے نہیں جاتی تھی ـــــ''

''ہیر رانجھے کی سٹوری میں ''رانجھا'' پیٹ پرست تھا ـــــ دراصل رانجھے کا ہیر کے باپ کی بارہ سال تک بھینسیں چرانے کا مقصد بھی ہیر کے ہاتھ کی چوری کھانا تھا۔ اپنے گھر میں تو اُس کی بھابھیاں اُس کو سوکھی روٹی کے چند ٹکرے بھی طعنے مہنے دے کر دیا کرتی تھی ـــــ کہاں وہ طعنوں سے بھری روکھی روٹی، کہاں یہ دیسی گھی سے لبالب بھری چوری ـــــ''

''بھئی اس طرح کے کھابے کے لیے تو بندہ بارہ کیا چوبیس سال بھی چاکری کرتا رہے تو گوارا ہے ـــــ''

''چلو رانجھا تو چوری کھاتا تھا، وجہ سمجھ میں آتی ہے، ہیر کی اُس کو چوری کھلانے کی وجہ کیا

تھی؟___"

"زنانہ خصلت___"

"عورت کی خصلت ہے کہ اُس کے ہاتھ کی بنی کسی چیز یا اُس کے پکائے ہوئے کسی کھانے کی کوئی مرد تعریف کر دے، یا تعریف نہ بھی کرے، بس ندیدوں کی طرح جھپٹ کر اُس کو کھا جائے تو بس عورت تو لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے، اُسی وقت مرمٹتی ہے اور پھر عمر بھر اُس اعتبار و اعزاز کو برقرار رکھنے کے لیے جلتے چولہے کے سامنے کھڑی رہ سکتی ہے۔___"

"یہ خصلت ہے محبت نہیں ہے، میرے حضور لیلیٰ اور مجنوں کے بارے میں کیا خیال ہے، اُن کی سٹوری میں تو کھانے پینے کا بھی کوئی چکر نہیں۔"

"وہ اور قصہ ہے___"

"کیا؟"

"قیس نے خوش الحانی میں لیلیٰ کو ہرا دیا تھا___"

"پھر"

"لیلیٰ سے اپنی شکست برداشت نہ ہوئی، اَنا کا مسئلہ تھا۔ پھر؟___"

قرآنِ مجید میں سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اور عورتوں کے مکر سے بچو، بے شک عورتوں کے فریب بہت بھاری ہوتے ہیں___"

"کہنا کیا چاہتی ہو، آج اپنی ہی جنس کے بخیے اُدھیڑ رہی ہو۔___ تم سنو تو سہی___"

"اچھا!___"

"لیلیٰ نے چال چلی۔ عورت مرد سے جسمانی قوت کے اعتبار سے کمزور ہے۔ وہ اُس کو چاروں شانے چت کرنے کے حربے سوچنے لگی۔ محبت کا ہتھیار استعمال کر کے سب سے زیادہ آسانی سے مرد کو ہرایا جا سکتا ہے___"

"یہ تو تم نے بڑی پتے کی کہی۔"

"مداخلت مت کرو، بس سنو، صرف سنو___"

"اوکے اوکے___"

"لیلیٰ نے بھی وہی چال چلی، قیس سے محبت کا اظہار کر دیا، اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت کے آنسو بھر لائی۔"

"اور تم نہیں جانتے۔ زیادہ بڑی آنکھوں میں قدرتی طور پر وحشت ہوتی ہے۔ جیسے تمہاری آنکھوں میں ہے۔"

وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"تم نے پھر مداخلت کی ہے ناں___"

اُس نے دانت پیسے___

"اچھا بابا! معاف کرو___"

"اَب نہیں کرنا۔"

"اچھا آگے بڑھو۔"

"قیس نے سمجھا کہ واقعی لڑکی گئی کہ گئی۔ معلوم ہے وہ سادہ دل محبت کے فریب میں آ گیا اور کسی کام کسی مقام کا نہ رہا۔ لیلیٰ کا مقصد پورا ہو گیا اور جس دن وہ بھک منگوں کی لائن میں کھڑا ہو کر لیلیٰ کے ہاتھوں نیاز کے چاول لینے لگا تو لیلیٰ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل میں کہا___ اب سناؤ بچو! کیسے حال حالات ہیں، بڑے آئے تھے، تلاوت کے مقابلے میں مجھ سے آگے نکلنے والے یہی سوچ رہی تھی کہ اُس کا نیاز دینے والا برتن کاسے پر پڑا اور قیس جو کہ بیماری و عشق کی وجہ سے پہلے ہی مدقوق ہو چکا تھا۔ کاسہ اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔ مجنوں نے پھر جنگل بیابانی کی___ لیلیٰ کو تو کسی نے گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ عشق ہوتا تو وہ بھی جنگلوں کی خاک چھانتی___"

"وہ کیسے چھانتی، عورت جو تھی، گھر والوں نے باندھ کے رکھا ہوا تھا۔"

"یہ تو سفا کی ہے!!"

"سفا کی نہیں یہ بھی عورت کی خصلت ہے، اُس کو اپنی تیار کردہ کسی بھی چیز سے بڑا پیار ہوتا ہے۔ اپنی ایجادات پر فخر ہوتا ہے اور قیس سے مجنوں کی تقلیب لیلیٰ کی ایجاد تھی، اُسے اپنی اُس ایجاد پر فخر تھا۔ شیریں___"

ابھی جملہ اُس کے منہ میں ہی تھا کہ اُس نے اچک لیا___"

"شیریں فرہاد کی تو تم بات ہی نہ چھیڑو۔ یہ کوئی دو طرفہ عشق کی داستان نہیں سراسر یک طرفہ معاملہ تھا___"

"مطلب کیا ہے تمہارا___؟"

"مطلب یہ ہے کہ فرہاد تو شیریں کے حسن و جمال کے چرچے سُن کے اُس کا غائبانہ

عاشق ہو گیا تھا۔''

''جیسے تمہارے کئی غائبانہ عاشق ہیں۔''

''تم اپنی بھانڈ بازی سے، مراثی سخنی سے باز نہیں آؤ گے ___''

وہ تپ گئی ___

''کیا اسی لیے منتیں کر کر کے بلواتے ہو مجھے؟؟؟''

''ارے نہیں نہیں، بابا نہیں، پلیز کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں، کہو تو یہی گناہ گار ہاتھ تمہارے پاؤں کو لگاتا ہوں۔ اَب معاف بھی کر دو ___''

''اچھا معاف کیا ___''

وہ منہ پھلا کے بیٹھ گئی۔

''آگے بولو ___''

''تو میں کہہ رہی تھی کہ غائبانہ عشق فرمانے والوں کے دماغ سے یہ کیڑا نکالنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ اُن کو تیشہ پکڑاؤ اور پتھر کاٹنے پہ لگا دو ___ جانتے ہو یہ عشق و محبت بقول مرشد بھرے پیٹ کی وارداتیں ہیں۔ کبھی کسی سخت جسمانی مشقت کرنے والے کو بھی محبت ہوئی ہے، اُس کو تو اپنی روٹی کے لالے پڑے ہوتے ہیں تو کسریٰ ایران نے اپنی فوج کے سپہ سالار کے دماغی خلل کی درستی کے لیے اُس کو کڑی جسمانی مشقت پر لگا دیا تاکہ پسینہ بہے، زائد جسمانی طاقت زائل ہو، جملہ مفسد رطوبات کا اخراج ہو اور بندے کا دماغ ٹھکانے آ جائے اور یہی ہوا موصوف فرہاد ذہنی تندرستی کے قریب تھے کہ ہلاک کر دیئے گئے ___''

''ہلاک کر دیئے گئے؟؟؟''

وہ حیرت سے لفظوں کو چبا چبا کر بولا۔

''اُس نے تو خودکشی کی تھی، وہی تیشہ اپنے سر پہ مار دیا تھا۔''

''سر پہ تیشہ مارنے والے ہاتھ اپنے ہوں یا کسی دوسرے کے، بات تو ایک ہی ہے نا اور وہ ہے ہلاکت!!''

''تم سسی پہ کوئی تہمت نہیں لگا سکتیں، کم از کم اُس کی محبت بے غرض اور بے لوث تھی ___''

''او یار تم نہیں سمجھ سکتے ___''

''سسی، صحبتِ ناجنس کی شکار تھی، صحرا کی مخلوق تھی، صحرا میں پیدا ہونے والوں کا واسطہ انسانوں سے کم اور گوہ، اژدھوں، خارپشتوں اور چوہوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے جانوروں کے درمیان پیدا ہونے والی اور پلنے بڑھنے والی لڑکی کو اگر کسی دن معمول سے ہٹ کر کوئی صاف ستھرا، نِک سک سے سنورا ہوا نوجوان نظر آ جائے تو سوچو وہ کیا کرے گی!!''

''یہ تو ہے یا تو وہ اُس سے شدید متاثر ہو گی اور اُس کی غیر معمولی توجہ پائے گی یا اُس کو دیوتا سمجھ کر اُس کی پوجا کرے گی۔''

''بہرحال اس کی جو بھی سمت ہو، ایک بات تو طے ہے کہ صحرائی ماحول کی بدوی لڑکی کی غیر معمولی توجہ ___ کیوں کہ نووارد کسی دوسرے ماحول کا تھا، وہ بدو لڑکی کے سارے سسٹم پر حاوی ہو گیا۔''

''تو پنوں کا کیا معاملہ تھا، اُس نے کیوں رسپانس دیا ___''

''خاک رسپانس دیا تھا، پنوں نے۔ پنوں دراصل Focus بنا ہوا تھا اور کسی ایسے انسان کی توجہ کا مرکز ہونا جس کے ساتھ آپ کا ماحول، آپ کی Frequency میچ نہ کرتی ہو۔ آپ کے اندر ایک لذت بھرا تجسس اُبھارتا ہے اور آپ اس تجسس کی ڈوری پکڑے ہوتے ہیں ___''

''یعنی تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ پنوں فلرٹ تھا۔''

''بالکل تھا، میں کہہ رہی ہوں کہ وہ فلرٹ تھا اور اس میں اُس پر کوئی الزام بھی نہیں آتا، کیوں کہ اس طرح کی صورت حال میں آپ محبت تو کر نہیں سکتے، ہاں البتہ فلرٹ ضرور کر سکتے ہیں۔''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کہنا کیا چاہ رہی ہو، کہیں تم نے عورت کو مکر کرنے والی یعنی مکار ثابت کیا اور کہیں مرد کو۔ ہر تعلق پر تم نے شبہ کیا ہے۔ شکوک کا اظہار کیا ہے۔ تم محبت بھی نہیں کرتیں۔ ملنے بھی آ جاتی ہو، آخر ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟؟''

''میں اتنی شدید گرمی میں تم سے اتنی دور سے ملنے آتی ہوں، مانتے ہو! ___''

''ہاں مانتا ہوں!! ___''

''حالاں کہ تم ماہیوال کی طرح باربی کیو تیار کر کے نہیں بیٹھے ہوتے ___ ناں مجھے باربی کیو کھانے سے کوئی دلچسپی ہے، مانتے ہو؟''

''ہاں ___ یہ بھی مانتا ہوں!! نہ ہی میرے اور تمہارے ماحول میں آسمان اور زمین کا فرق ہے کہ تم میرے لیے بالکل ہی کوئی نئی اور آسمانی قسم کی شے ہو کہ میری توجہ کو سمیٹ سکو۔ سسی کی

طرح۔"
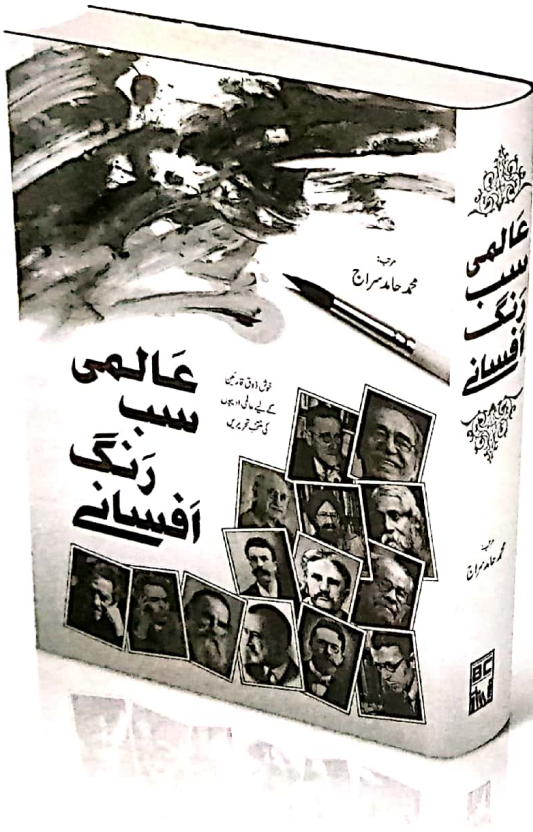
"مانتے ہوناں!!____"

"ہاں! میں سب کچھ مانتا ہوں یار____"

"میں پھر بھی تم سے ملنے آتی ہوں، کیوں کہ تم بار بار بلاتے ہو، میں جانتی ہوں تمہیں مجھ سے ملنے کا شوق کیوں ہے، نہ تو تمہیں میری فضول باتوں سے کوئی لگاؤ ہے، نہ ہی میری دانش سے کوئی غرض ہے، نہ میری شکل قیامت، نہ میری چال سلامت نہ میرا قد و قامت کہ میں خود کو کسی خوش فہمی میں مبتلا رکھوں____"

"تو پھر کیوں آتی ہو؟؟؟؟"

وہ سراپا سوال بن گیا!! وہ کتنی ہی دیر تک چپ چاپ اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی____

"بتا دوں کیوں آتی ہوں____"

اُس نے تجسس کو بڑھاوا دیا____

"ہاں بتاؤ!!"

"بس یونہی____"

"بس یونہی____" آتی ہوں!!! "محبت" بس یونہی تو ہے!!!

منزہ احتشام گوندل 20 اکتوبر 1984ء کو ضلع سرگودھا کے مضافات میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ''للیانی'' میں
حاصل کرنے کے بعد غوثیہ گرلز کالج بھیرہ سے فاضل عربی اور گریجوایشن کیا۔ 2007ء میں سرگودھا یونیورسٹی سے ایم
اے اُردو کیا اور 2009ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے لیکچرر ہو گئیں۔ 2012ء میں سرگودھا یونیورسٹی
سے ایم فل کیا اور پی ایچ ڈی کا مقالہ ''ترقی پسند تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا کردار'' کے عنوان سے تحریر
کیا۔ ان کی اس سے قبل نثری اور آزاد نظموں کی کتاب ''منزہ نظمیں'' 2015ء میں طبع ہو کر شاعری کے سنجیدہ قارئین
سے داد وصول کر چکی ہے۔ آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج فار وومن کوٹمومن میں پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔
ناشران
بک کارنر
جہلم، پاکستان
facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
info@bookcorner.com.pk
ISBN: 978-969-662-069-3
Rs.400.00
Title: Abu Imama
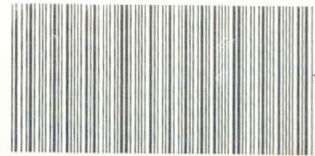
رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+